يَاَيُّهَا النَّاسُ! قَدْ اَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ

(اے لوگو، تم پر ایک عظمتوں والا مہینہ سایہ فگن ہو چکا ہے)

روزہ اور قرآن

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ: اَيْ رَبِّ اِنِّيْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ، وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِيْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سُنے گا) روزہ عرض کرے گا اے میرے رب! میں نے اس بندے کو دن میں کھانے پینے اور نفس کی خواہش پُورا کرنے سے روکے رکھا تھا آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اس کو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لیے جنّت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا)۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۳ | شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ فروری ۹۴ | شمارہ ۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ - فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بخاری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۔/۶۰ روپے، فی شمارہ ۔/۶ روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی قریباً تمام مطبوعات، سوائے دو تین کتابوں کے، انجمن کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تصنیفی و تالیفی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے بعض براہ راست ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلی ہیں اور بعض ان کے دروسِ قرآنی اور خطاباتِ عام پر مشتمل ہیں جنہیں مرتب کر کے کتابی صورت دی گئی ہے۔ ان میں سے جس کتابچے کو سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہوا اور جسے بجا طور پر اس دعوتِ قرآنی کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے وہ تو بلاشبہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ہی ہے تاہم دیگر بنیادی اہمیت کے کتابچوں میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کرنے کا اصل کام" اور "راہ نجات۔ سورۃ العصر کی روشنی میں" کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ یہ تینوں کتابچے قریباً ربع صدی قبل منصۂ شہود پر آئے تھے اور گزشتہ بیس پچیس برسوں کے دوران نہ صرف یہ کہ ان کے متعدد ایڈیشن طبع ہو کر وسیع حلقہ تک پھیل چکے ہیں بلکہ بحمد اللہ ان کے انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں اور ان کے بھی کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

"راہِ نجات۔ سورۃ العصر کی روشنی میں" ہی کی مانند محترم ڈاکٹر صاحب کی ایک نسبتاً تازہ تالیف "امتِ مسلمہ کے لئے سہ نکاتی لائحہ عمل" جو پہلی بار ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی، دعوتی و تحریکی اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب درحقیقت سورۃ آل عمران کی تین آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے جس کے ذریعے مسلمانوں کے لئے ایک سہ نکاتی لائحہ عمل متعین ہوتا ہے جس میں انفرادی و اجتماعی ہر دو سطحوں پر مسلمانوں کے لئے ہدایت و رہنمائی کا وافر سامان موجود ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے بھی کسی قدر تلخیص کی صورت میں انگریزی زبان کے قالب میں ڈھال لیا گیا ہے تاکہ قرآن کا یہ پیغام وسیع تر حلقے تک پہنچ سکے۔ 'حکمتِ قرآن' کے زیر نظر شمارے میں اسکی تیسری اور آخری قسط شامل کی گئی ہے جبکہ ابتدائی دو اقساط بالترتیب دسمبر ۹۳ء اور جنوری ۹۴ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قارئین نے اس انگریزی ترجمے کی افادیت بھرپور طور پر محسوس کی ہوگی۔ کتابی صورت میں اس کی اشاعت سے قبل قارئین کرام میں سے کوئی صاحب اس کے بارے میں ہمیں اگر کوئی رائے یا مشورہ دینا چاہیں تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ○○

مطالعۂ قرآن حکیم

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورَۂ ھُود

(آیات ۸۱—۸۳)

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم۔ اما بعد:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۞ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ۞ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۞

"فرشتوں نے کہا: اے لوط! ہم تو تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہرگز تم پر دست درازی نہ کر سکیں گے، پس تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ۔ اور تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے، سوائے تمہاری بیوی کے، اس پر بھی وہی کچھ بیتنا ہے جو ان سب پر بیتنے والا ہے! ان کی ہلاکت صبح کے وقت طے ہے، کیا صبح آیا ہی نہیں چاہتی ہے — پس جب آ پہنچا ہمارا حکم تو ہم نے اس بستی کو الٹ کر رکھ دیا اور اس پر پتھروں کی بارش کی، تہہ در تہہ اور تیرے رب کے پاس سے نشان زدہ، اور وہ ان ظالموں سے بھی ہرگز دور نہیں!" —

گزشتہ درس کا اختتام حضرت لوط علیہ السلام کے ان حد درجہ یاس آمیز الفاظ پر ہوا تھا

کہ "لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ" ــــ سورۂ ہود کے متصلاً بعد سورۂ یوسف ہے اور اس کے آخر میں بھی اس کیفیت کا نقشہ ایک عمومی قاعدے کے طور پر کھینچا گیا ہے کہ "حَتّٰی اِذَا اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ ....." یعنی جب رسول اپنی قوم کی جانب سے بالکل مایوس ہو جاتے ہیں تب اللہ کی مدد آ پہنچتی ہے : "فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ" ـ "پھر نجات دی گئی جسے ہم نے چاہا، اور نہیں لوٹایا جا سکتا ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے"!

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس بھی اللہ کے فرشتے اسی قانونِ خداوندی کے تحت پہنچے تھے لیکن انسانی شکل میں ہونے کے باعث آنجنابؑ انہیں پہچان نہ سکے اور وہ صورت پیش آئی جو آیات ۷۷ تا ۸۰ میں بیان ہو چکی ہے۔ واضح رہے کہ بعینہٖ یہی معاملہ اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ وہ بھی ان ہی فرشتوں کو عام مہمان اور معمولی انسان سمجھ کر معاملہ کر چکے تھے ــــ اور ٹھیک یہی معاملہ حدیثِ جبرئیلؑ کی بعض روایات کی رُو سے ایک مرتبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ کہ جب حضرت جبرئیلؑ انسانی صورت میں آ کر گفتگو کر کے چلے گئے تب آپؐ نے فرمایا "رُدُّوْہُ اِلَیَّ" یعنی "انہیں میرے پاس واپس لاؤ!" اور جب تلاشِ بسیار کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا تو آپؐ نے فرمایا: "اچھا! یہ جبرئیلؑ تھے ــــ اور یہ پہلی بار ہے کہ میں انہیں پہچان نہیں سکا!"

بہر حال جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو فرشتوں نے اپنی حقیقت کو ظاہر کر دیا کہ اے لوطؑ! ہمیں انسان اور عام مہمان نہ سمجھ، ہم اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں اور تم پوری طرح مطمئن رہو کہ یہ خبیث ہمارا یا تمہارا کچھ بگاڑنا تو درکنار تم تک پہنچ بھی نہ سکیں گے۔ اس کے بعد فوری طور پر کیا صورتِ معاملہ پیش آئی اس کی تفصیل قرآنِ حکیم میں موجود نہیں ہے لیکن بعض تفسیری روایات میں جو تفاصیل آئی ہیں وہ صورتِ واقعہ سے پوری مطابقت رکھتی ہیں اور ہرگز نہ خلافِ عقل ہیں نہ خلافِ قیاس یعنی یہ کہ فرشتوں نے حضرتِ لوطؑ اور ان کے اہلِ خانہ کو تو گھر کے اندر کی جانب بھیج دیا اور اپنے بازو کو ذرا سا ان ملعونوں کی جانب لہرایا جس کے باعث وہ سب کے سب دفعتًہ اندھے ہو گئے اور لرزاں و ترساں راہِ فرار اختیار کر گئے۔ اس کے بعد جیسا کہ آیات زیرِ درس میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے، فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم حضرت لوطؑ کو وضاحت کے ساتھ پہنچایا کہ اس قوم پر عذابِ استیصال کا وقت آ پہنچا

ہے اور ان کی ہلاکت کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے جو اب طلوع ہوا ہی چاہتی ہے' لہٰذا تم جلدی کرو اور اپنے اہل و عیال سمیت صبح ہونے سے پہلے پہلے اس بستی سے دور نکل جاؤ ـــــ اور خبردار! تم میں سے کوئی اس بستی کی جانب پلٹ کر بھی نہ دیکھے! ـــــ اس کے دو مفہوم ممکن ہیں : ایک یہ کہ عذاب اتنا ہولناک ہوگا کہ کوئی انسان اس کو دیکھنے کی تاب بھی نہ لا سکے گا اور دوسرے یہ کہ اس گندی بستی اور اس کے خبیث رہنے والوں کی جانب کوئی ادنیٰ سا میلان بھی غیرتِ الٰہی کو گوارا نہیں ہے۔

ساتھ ہی فرشتوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ حضرت لوطؑ کی بیوی عذابِ الٰہی سے مستثنیٰ نہیں ہے اور اس کا انجام بھی وہی ہونا ہے جو اس پوری بستی کا' اس لیے کہ وہ اغلباً تھی بھی اسی قوم سے اور اس کا سارا جھکاؤ بھی ان ہی کی جانب تھا۔ حضرت لوطؑ کی بیوی کے بارے میں تو یہ صراحت قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر موجود ہے ہی' سورۃ التحریم سے معلوم ہوتا ہے کہ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت نوح علیہ السلام کی ایک بیوی کے ساتھ بھی ہوا۔ وہاں ان دونوں جلیل القدر پیغمبروں کی بدنصیب بیویوں کا ذکر ایک ساتھ آیا ہے اور صراحت فرما دی گئی ہے کہ " فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ " کہ وہ دونوں جلیل القدر پیغمبر اپنی بیویوں کو عذابِ الٰہی سے بچا نہ سکے اور دونوں کے حق میں حکمِ الٰہی صادر ہو گیا کہ داخل ہو جاؤ آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ گویا نہ صرف یہ کہ یہ دونوں اس دنیا میں عذابِ استیصال سے دوچار ہونے کے معاملے میں اپنی قوم کے ساتھ رہیں بلکہ آخرت میں عذابِ جہنم میں بھی اپنی قوم کے ساتھ ہی مبتلا ہوں گی۔ گویا ہر انسان اللہ کے یہاں اپنے ہی کیے کی جزا یا سزا پائے گا کسی دوسرے کی بزرگی یا نیکی اس کے کام نہ آئے گی خواہ وہ نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہوں۔

آیات ۸۲، ۸۳ میں عذابِ الٰہی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ واقعۃً نہایت ہولناک ہے۔ یعنی یہ کہ اس بدکار قوم کی بستیوں پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوئی جو مسلسل بھی رہی اور وقفے وقفے سے بھی' یعنی تہہ بر تہہ۔ نتیجۃً عمارتیں ڈھے گئیں' ان کی بلندیاں نیچے آ رہیں' اور تمام بستیاں اور ان میں بسنے والے تمام لوگ نیست و نابود اور نسیاً منسیاً ہو کر رہ گئے۔

واضح رہے کہ یہ بستیاں جن کا اب نام و نشان بھی مٹ چکا ہے' اغلباً بحیرۂ مردار کے جنوبی

ساحل پر آباد تھیں۔ ان کا مقام سدوم تھا اور دوسرا بڑا شہر عامورہ تھا۔ ان کے علاوہ چند بڑے شہر اور بھی تھے اور ان کا درمیانی پورا علاقہ نہایت سبز و شاداب تھا۔ گویا ہر طرف باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔ متذکرہ عذابِ الٰہی جو آسمان سے نازل ہوا تھا اس کے بعد غالباً کوئی زلزلہ وغیرہ بھی آیا جس نے ان بستیوں کے آثار کو بھی بحیرۂ مردار یا بحیرۂ لوط میں غرق کر دیا۔ "مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ" کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ یہ عام پتھر نہ تھے بلکہ خاص اسی مقصد کے لیے بنائے اور نشان زدہ کیے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ ہر پتھر جس ظالم کی ہلاکت کا ذریعہ بننے والا تھا اس پر گویا اس کا نام پہلے سے کندہ موجود تھا۔

اسی طرح آخری ٹکڑے یعنی "وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ" کے بھی کئی مفہوم ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ "ھِیَ" کی ضمیر پتھروں کی جانب راجع مانی جائے۔ اور معنی یہ مراد ہوں کہ اللہ کو ان کی ہلاکت کے لیے یہ پتھر کہیں دُور سے نہیں لانے پڑے بلکہ وہ ان کے آس پاس ہی سے اٹھا لیے گئے تھے، دوسرے یہ کہ "ھِیَ" سے مراد وہ بستیاں ہوں جو اس عذاب کا نوالہ بنیں اور "الظالمین" سے مراد قریش ہوں جن کو یہ داستان سنائی جا رہی تھی۔ اور جو انکار و اعراض کی اس روش پر چل رہے تھے جس پر سابقہ معذّب قومیں چلی تھیں۔ اور مراد قریش کو اس جانب متوجہ کرنا ہو کہ یہ واقعات کہیں دُور دراز مقامات پر پیش نہیں آئے تمہارے قرب و جوار ہی میں پیش آئے ہیں، تو چاہیے کہ تم ان سے عبرت پکڑو۔ اور تیسرے یہ کہ "ھِیَ" میں اشارہ اُن پتھروں ہی کی جانب ہو اور قریش کو دھمکی دی جا رہی ہو کہ عذابِ الٰہی کے یہ پتھر تم سے بھی دُور نہیں ہیں بلکہ گویا تمہارے سروں پر سایہ کیے ہوئے ہیں! —— یہ آخری بات اس لیے راجح معلوم ہوتی ہے کہ قرآن میں ان حالات و واقعات کا تذکرہ ظاہر ہے کہ داستان سرائی کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کا تمام تر مقصد انذار و تخویف ہے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں ان "اَنْبَاءُ الرُّسُل" کے بیان کا مقصد یہی بیان کیا گیا ہے کہ ان سے ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی صحابہ کرامؓ کے دلوں کو ڈھارس بندھے اور تقویت حاصل ہو اور دوسری جانب اہل کفر و شرک کو یہ تنبیہ ہو جائے کہ "اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ" یعنی ہم اپنا کام کیے چلے جا رہے ہیں، تم بھی جتنا زور لگا سکتے ہو لگا لو۔ بالآخر حکمِ خداوندی سے وہی کچھ ہوگا جو ہوتا آیا ہے۔ یعنی نجات و کامیابی اور فوز و فلاح رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کا حصّہ قرار پائے گی اور دنیوی ہلاکت و تباہی اور اُخروی عذاب کافروں کا مقدّر بن کر رہے گا۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ٥

قرآن مجید کی اثر انگیزی (۲)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

قرآن حکیم کی اثر انگیزی اور دلکشی کا یہ حال تھا کہ اسے سن کو لوگوں پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی اور ان کا دل لرز لرز اٹھتا تھا۔ متعدد لوگ اسی طرح آیاتِ الٰہی سن کر متأثر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم ﷺ کو مغرب کی نماز میں سورۃ الطور پڑھتے سنا اور جب آپؐ نے یہ آیات تلاوت کیں:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ○ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ○

(آیات ۳۵ تا ۳۷)

"کیا وہ لوگ خود بخود بلا کسی چیز کے پیدا ہوئے ہیں یا وہی پیدا کرنے والے ہیں' یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ (نہیں' یہ سب کچھ نہیں) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ کیا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں یا وہی داروغہ ہیں؟"

تو میرا دل دھڑکنے لگا' اور اس کی عجیب کیفیت ہو گئی[1] اور یہی وہ پہلا موقع تھا جب اسلام کی عظمت و تاثیر میرے دل میں راسخ ہو گئی[2]

دعوتِ نبویؐ کا پانچواں سال تھا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اور مشرکین کی تکلیف و ایذاء رسانی روز بروز شدّت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس لئے

۱۔ صحیح بخاری' ج ۲' تفسیر سورۃ الطور
۲۔ الاتقان' ج ۲' ص ۱۳۳

مسلمانوں کو ہجرتِ حبشہ کا حکم ملا تاکہ وہاں کے رحمدل اور منصف مزاج عیسائی بادشاہ نجاشی کی سلطنت میں کچھ مسلمان امن و اطمینان کی زندگی گزار سکیں۔ لیکن مشرکین مسلمانوں کے آرام و آسائش کو کب گوارا کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک وفد ہدایا اور تحائف کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ اسے مسلمانوں کے خلاف برافروختہ کردیں اور وہ ان مظلوموں کو ان کے حوالہ کردے۔ لیکن نجاشی اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوا اور تحقیق کے لئے اس نے مسلمانوں کو طلب کیا۔ حضرت جعفر طیار ؓ نے جو اس جماعت کے قائد تھے ایک پُراثر تقریر کی جس سے نجاشی بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے کہا: اچھا تمہارے نبی پر جو کلام اترتا ہے' اس میں سے اگر کوئی حصہ یاد ہو تو ہم کو بھی سناؤ! حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی کچھ آیتیں سنائیں جن کو سن کر نجاشی اور اس کے درباری اس قدر زار و قطار روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہوگئیں۔ پھر اس نے کہا کہ یہ اور حضرت مسیحؑ کا دین ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ اور کفار سے کہا کہ تم لوگ جاؤ' میں انہیں تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔[۳]

جب آنحضرت ﷺ کی دعوتِ توحید کا قرب و جوار میں چرچا ہوا تو قبیلہ غفار کے حضرت ابوذرؓ نے اپنے بھائی انیسؓ کو مکہ بھیجا تاکہ اس نبیؐ کے متعلق صحیح معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے آنحضور ﷺ کی باتیں سنیں تو اپنے بھائی کو آکر بتایا کہ وہ تو نہایت عمدہ باتوں کی تعلیم دیتا ہے اور جو کچھ خدا کا کلام سناتا ہے بخدا وہ شعر و کہانت نہیں' میں خود شاعر ہوں اور میں نے اس کی باتیں شعر کے اوزان پر پرکھیں مگر محمد (ﷺ) نہ شاعر ہیں نہ ان کے کلام کو شعر کہا جاسکتا ہے۔[۴]

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کا اشتیاق اور بڑھا اور وہ خود مکہ تشریف لے گئے اور وہاں کلامِ الٰہی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کرکے واپس آئے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ ازد کے ایک شخص ضماد جو جھاڑ

۳۔ سیرت ابن ہشام' بر حاشیہ روض الانف' ج ۱' ص ۲۱۳
۴۔ صحیح مسلم' باب فضائل ابی ذر

پھونک کرتے تھے' مکہ آئے۔ یہاں انہوں نے لوگوں سے سنا کہ محمد (ﷺ) دیوانہ ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ اگر میری ان سے ملاقات ہو جائے تو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شفاء دے دے گا۔ اس لئے وہ آپؐ سے ملنے آئے اور کہنے لگے: محمد (ﷺ)! میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور جسے اللہ چاہتا ہے میری بدولت اس کو شفاء ہو جاتی ہے' اگر آپ چاہیں تو میں جھاڑ پھونک کر دوں۔ آپؐ نے ان کے سامنے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر کلام مجید کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ ضمادؓ پر ان کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کہنے لگے: میں نے کاہنوں' ساحروں اور شاعروں کی باتیں سنی ہیں' لیکن آپؐ کے کلام کو ان سے کوئی واسطہ نہیں' اس کا اثر تو سمندروں پر بھی ہو سکتا ہے۔ پھر انہوں نے اسلام لانے کی خواہش ظاہر کی اور مسلمان ہو گئے۔[۵]

حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ کی مجلس میں تشریف فرما تھے کہ حضرت جبرئیلؑ تشریف لائے۔ ان کے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے عثمانؓ سے فرمایا: ابھی تمہاری موجودگی میں حضرت جبرئیلؑ آئے تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ جبرئیلؑ نے آپ سے کیا کہا؟ آنحضرت ﷺ نے سورۃ النحل کی یہ آیت پڑھی:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (آیت ۹۰)

"بیشک اللہ عدل' احسان اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے' اور بے حیائی' منکر اور سرکشی سے روکتا ہے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو"

عثمان بن مظعون ؓ کہتے ہیں: یہ سن کر میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور قلب میں ایمان راسخ ہو گیا اور میں آنحضرت ﷺ سے بڑی محبت کرنے لگا۔[۶]

۵۔ صحیح مسلم' کتاب الجمعہ ۶۔ مسند احمد بن حنبل' ج ۱' ص ۳۱۸

خالد عدوانیؓ نے سفرِ طائف میں رسول اللہ ﷺ کو سورۃ الطارق پڑھتے سنا تو اگرچہ اس وقت اسلام قبول نہیں کیا لیکن کلام الٰہی کی تفسیر دل میں پوری طرح گھر کر گئی اور وہ پوری سورت ان کو زبانی یاد ہو گئی۔[۷]

طفیل بن عمرو دسیؓ جو اپنے قبیلہ کے سردار' بڑے زیرک اور اچھے شاعر تھے' خود اپنے اسلام لانے کا حال بیان کرتے ہیں کہ مجھے مکہ آنے اور قریش کے کچھ لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا' ان لوگوں نے کہا: طفیل! تم شاعر بھی ہو اور اپنی قوم کے رئیس و متاع بھی' ہم کو خطرہ ہے کہ اگر تمہاری اس شخص سے ملاقات ہو گئی اور اس کی کوئی بات تم نے سن لی تو وہ سحر کی طرح تمہارے دل پر اثر انداز ہو جائے گی' اس لئے تم خوب چوکنے اور ہوشیار رہو' ورنہ ہم لوگ جس چیز میں مبتلا ہیں اسی میں وہ تم کو اور تمہاری قوم کو بھی مبتلا کر دے گا' یہ شخص مرد و زن اور باپ بیٹوں میں جدائی پیدا کر دیتا ہے۔ طفیلؓ کہتے ہیں کہ اسی طرح وہ لوگ برابر اصرار کے ساتھ منع کرتے رہے اور میں نے بھی طے کر لیا کہ مسجد میں کان بند کر کے داخل ہوں گا۔ چنانچہ میں اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر مسجد میں گیا۔ وہاں رسول اللہ ﷺ کھڑے نظر آئے' میں بھی آپؐ کے قریب کھڑا ہو گیا' اللہ کو سنانا منظور تھا' آپ ﷺ نماز میں قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ میں نے اپنے جی میں کہا: یہ آدمی تو بڑا شاندار معلوم ہوتا ہے۔ اور بخدا مجھے اپنے اوپر پورا اعتماد اور اطمینان تھا کہ کسی چیز کا حسن و قبح مجھ سے مخفی نہ رہے گا۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ ان کی بات ضرور سن کر رہوں گا' اگر درست معلوم ہوئی تو قبول کر لوں گا اور اگر وہ ٹھیک نہ ہو گی تو اس سے اجتناب کروں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے کانوں کی روئی نکال دی اور آپؐ کی باتیں توجہ سے سننے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہتر کلام' دلکش انداز اور خوب تر الفاظ میں نے کبھی نہ سنے تھے۔ اس کے بعد میں آپؐ کا انتظار کرتا رہا۔ جب آپؐ اپنے گھر تشریف لے چلے تو میں بھی آپؐ کے ہمراہ ہو گیا اور گھر پہنچنے کے بعد میں نے عرض کیا: آپؐ کی قوم مجھ سے اس طرح کہہ رہی تھی اور اس نے شدت کے ساتھ آپؐ کی باتیں سننے سے منع کیا تھا' لیکن خداوند قدوس کو سنانا مقصود تھا۔ اس کو سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپؐ جو کچھ فرماتے اور پیش کرتے ہیں وہ

۷۔ مسند احمد بن حنبل' ج ۴' ص ۳۲۸

بالکل سچ ہے' اس لئے آپؐ میرے سامنے اپنا دین پیش کیجئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دین کی دعوت پیش کی اور قرآن مجید کی تلاوت کی۔ خدا شاہد ہے کہ اس سے بہتر اور برتر کلام میں نے کبھی نہ سنا تھا' اس لئے میں مسلمان ہو گیا اور آپؐ سے عرض کیا: میں اپنے قبیلہ کا سردار ہوں' ان کو بھی اسلام کی دعوت دوں گا۔[۸]

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جو مسلمان حبشہ کی ہجرت کے لئے روانہ ہو رہے تھے ان میں میرے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی تھے' مگر وہ مکہ سے دو یا ایک دن کی مسافت طے کر سکے تھے کہ راہ میں ابن الدغنہ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے دریافت کیا: ابوبکر کہاں کا قصد ہے؟ جواب دیا: ہماری قوم نے ہم کو نکال دیا ہے' وہ ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں دیتی ہے۔ ابن الدغنہ نے کہا: آخر تم جیسے آدمی کے ساتھ یہ سلوک کیا جا رہا ہے؟ تم تو بہت خوب آدمی ہو اور غریبوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہو' نیک کام کرتے ہو' اس لئے واپس چلو' تم میری پناہ میں رہو گے۔ چنانچہ واپس لوٹ آئے اور جب مکہ پہنچے تو ابن الدغنہ نے قریش سے کہا: میں نے ابو قحافہ کو پناہ دی ہے' اس لئے کوئی انہیں تنگ نہ کرے۔ انہوں نے کہا: تم نے ایسے آدمی کو پناہ دی ہے جو ہمیں تکلیفیں دیتا ہے' اس شخص نے ایک چھوٹی سی مسجد بنائی ہے اور اس میں جب نماز پڑھتا اور تلاوت قرآن کرتا ہے تو اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے اور وہ رونے لگتا ہے' یہ دیکھ کر ہمارے بچے اور عورتیں اکٹھا ہو جاتی ہیں اور قرآن سے متاثر ہوتی ہیں۔[۹]

حبش سے تقریباً ۲۰ عیسائی آنحضور ﷺ کی بعثت کی اطلاع پا کر مکہ آئے' انہوں نے آپؐ کو مسجد میں پایا اور وہیں آپؐ کے پاس بیٹھ کر باتیں اور سوالات کئے' جب ان کے سوالات ختم ہوئے تو آپؐ نے انہیں خدا پرستی کی تلقین کی اور قرآن سنایا۔ وہ لوگ قرآن سن کر زار و قطار روئے اور پھر ایمان لائے اور خدا کی پکار پر لبیک کہا۔[۱۰]

۸۔ الاستیعاب لابن عبدالبر' ج ۱۰' ص ۲۱۸' نیز اسد الغابہ اور سیرت ابن ہشام میں بھی یہ واقعہ ملتا ہے۔

۹۔ سیرت ابن ہشام' ج ۱' ص ۲۳۱

۱۰۔ سیرت ابن ہشام' ص ۲۳۹

حج کے موقع پر مختلف قبیلوں اور شہروں کے لوگ اکٹھے ہوتے تو آپ ﷺ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن سناتے۔ مدینہ منورہ سے آنے والے لوگوں نے اسی طرح دینِ حق قبول کیا۔ اور جب کفار قریش کا ظلم و ستم حد سے بڑھا تو انہوں نے آنحضور ﷺ اور آپؐ کے اصحابؓ کو وہیں بلا لیا۔ اس طرح مدینہ آگے چل کر اسلام اور دعوتِ رسالت کا اولین مرکز بنا۔ لیکن اول اول حج کے موقع پر کچھ لوگ قرآن کی اثر آفرینی ہی کی بدولت حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں قرآن سنایا اور خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دی۔[۱۱]

سعید بن معاذ اور اسید بن حضیر کے سامنے جب مصعب بن عمیرؓ نے اسلام پیش کیا اور قرآن مجید سنایا تو وہ اس کی حقانیت و تاثیر سے اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔[۱۲]

ابو عبیدہ بن حارث' ابو سلمہ بن عبدالاسود' ارقم بن ابی الارقم اور عثمان بن مظعون (رضی اللہ عنہم) رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھا تو وہ اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے اور گواہی دی کہ آنحضرت ﷺ ہدایت و بصیرت پر ہیں۔[۱۳]

متعدد لوگوں نے قرآن حکیم کی بلاغت کی داد اور اس کے کمال تاثیر کی شہادت دی ہے۔ مثلاً ولید بن مغیرہ کے سامنے جب آنحضور ﷺ سورۃ النحل کی آیت "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی.....الخ" پڑھی تو اس نے کہا: اس کلام میں اہل ذوق کے لئے بڑی حلاوت اور دلآویزی ہے اور یہ بڑا پر رونق اور پر جمال ہے' اس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں برگ و بار آور ہیں۔[۱۴]

ایک اعرابی نے ایک شخص کو "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ" (الآیہ) پڑھتے سنا تو وہ اس کی بلاغت سے اس قدر مرعوب و متاثر ہوا کہ

۱۱۔ سیرت ابن ہشام' ج ۱' ص ۲۳۱

۱۲۔ سیرت ابن ہشام' ص ۲۷۲

۱۳۔ اسد الغابہ' ج ۵' ص ۲۱۸

۱۴۔ شرح الشفاء' ج ۲' ص ۵۲۸

سجدہ میں گر پڑا۔[۱۵]

ایک اور اعرابی نے آیت "فَلَمَّا اسْتَيْأَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا" (یوسف: ۸۰) سنی تو بول اٹھا کہ اس طرح کا کلام کسی مخلوق کا نہیں ہو سکتا۔[۱۶]

یہ تو چند واقعات ہیں۔ تاریخ اسلام اور خصوصاً دورِ نبوت کے واقعات کی اگر چھان بین کی جائے تو متعدد اشخاص کے قبول اسلام اور اعتقادِ رب العزت کا اولین سبب قرآن کی تاثیر و بلاغت ہی نظر آئے گی۔ ہم اس سلسلہ کو خلیفہ ثانی امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے واقعۂ اسلام پر ختم کرتے ہیں جو بڑا اہم' پر سوز اور پر اثر ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام و ایمان کا خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتظار تھا اور انؓ کے قبولِ اسلام سے مسلمانوں کو واقعتاً بڑی تقویت ملی۔ اسلام لانے کے بعد ان کو جس درجہ شدید تعلق اسلام سے ہو گیا تھا اسی درجہ گہرا تعلق قبولِ اسلام سے قبل اپنے آبائی دین سے تھا۔ چنانچہ جب انہیں اس دین کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے' یہاں تک کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینے کا ارادہ بھی ان کے دل میں آیا۔ مگر مشیتِ الٰہی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ کلامِ ربانی کی چند آیتیں کانوں سے ٹکرائیں تو دفعتاً تمام نقشۂ جنگ ہی بدل گیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل و ہلاکت کا ناپاک جذبہ ان کی عقیدت و محبت کے پاکیزہ جذبہ میں تبدیل ہو گیا اور وہی تلوار جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سر قلم کرنے کے لئے اٹھی تھی اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے قتل کے لئے اٹھنے لگی۔

کتبِ سیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے متعلق کئی روایتیں ملتی ہیں لیکن قرآن کی اثر انگیزی ان سب میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم مولانا شبلی نعمانی کے قلم سے اس واقعہ کو بہ تمام و کمال نقل کرتے ہیں' کیونکہ ؎

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس
عندلیب آشفتہ تر گفت است ازیں افسانہ را

"حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ عرب میں آفتابِ رسالت طلوع ہوا'

۱۵۔ و ۱۶۔ اسد الغابہ' ص ۵۲۹

یعنی رسول ﷺ مبعوث ہوئے اور اسلام کی صدا بلند ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زیدؓ کی وجہ سے توحید کی آواز بالکل نامانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے۔ سعید کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا۔ اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں۔ اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا' لیکن حضرت عمر ابھی تک اسلام سے بالکل بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے' یہاں تک کہ قبیلے میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے۔ لیبنہ ان کے خاندان میں ایک کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا' اس کو بے تحاشا مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں تو پھر ماروں گا۔ لیبنہ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زدوکوب سے دریغ نہیں کرتے تھے' لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا' ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بددل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ (نعوذ باللہ) خود بانیٔ اسلام کا قصہ پاک کر دیں۔ تلوار کمر سے لگا سیدھے رسول اللہ ﷺ کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا ع

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ "محمد (ﷺ) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں"۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو' خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں' ان کی آہٹ پا کر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزاء چھپا لئے۔ لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ بہن سے پوچھا کہ یہ کیا آواز تھی؟ بہن نے کہا کچھ نہیں۔ بولے کہ "نہیں میں سن چکا ہوں کہ تم دونوں مرتد ہو گئے"۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہو گئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی' یہاں تک کہ ان کا بدن لہو لہان ہو گیا۔ اس حالت میں ان کی زبان سے نکلا کہ "عمر! جو بن آئے

کرو لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔" ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر ایک خاص اثر کیا' بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا' ان کے بدن سے خون جاری تھا' یہ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا کہ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ۔ فاطمہؓ نے قرآن کے اجزاء لاکر سامنے رکھ دیئے' اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ تھی: سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا' یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ تو بے اختیار پکار اٹھے کہ "اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ"۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارقمؓ کے مکان میں' جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا' پناہ گزیں تھے۔ حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی۔ چونکہ شمشیر کھنچ گئے تھے اور اس تازہ واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ ملی اس لئے صحابہؓ کو تردد ہوا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ ﷺ خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا: "کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟" نبوت کی پُر رعب آواز نے ان کو کپکپا دیا' نہایت خضوع کے ساتھ عرض کی کہ "ایمان لانے کے لئے"۔ آنحضرت ﷺ بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں"۔[۱۷]

قرآن کے حیرت انگیز اثرات سے انسان تو انسان جنّات بھی مرعوب و متأثر ہوئے۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب طائف سے مایوس ہو کر مکہ لوٹ رہے تھے تو ایک شب وادی نخلہ میں نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور تلاوتِ قرآن شروع کی تو جنوں نے اس کو سن کی حیرت انگیز اثر قبول کیا اور بعد میں اپنی قوم کو بھی اس کی دعوت دی۔ سورۃ

۱۷۔ الفاروق' ج اول' از صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۴' بحوالہ انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن اثیر۔

الاحقاف اور سورۃ الجن میں اس کی جانب اشارے کئے گئے ہیں۔ سورۃ الاحقاف میں ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ' فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا' فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ○ قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ یَهْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ○ یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ○ (آیات ۲۹ تا ۳۱)

"اور یاد کرو جب ہم نے تمہاری طرف جنوں کا ایک گروہ قرآن سننے کے لئے پھیر دیا' جب وہ وہاں پہنچے تو باہم دگر بولے کہ چپ چاپ رہو' پھر جب ختم ہوا تو وہ اپنی قوم کے پاس لوٹے اور تنبیہہ کرنے لگے۔ انہوں نے کہا اے ہماری قوم ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی ہے' جو اپنے سے پہلے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور جو حق اور سیدھی راہ دکھاتی ہے۔ اے قوم کے لوگو! اللہ کی طرف بلانے والے کا جواب دو اور اس پر ایمان لاؤ تو وہ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور تم کو دردناک عذاب سے بچالے گا۔

ایک جگہ قرآن مجید نے اپنی عظمت و تاثیر کا اس طرح ذکر کیا ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ' وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ○ (الحشر:۲۱)

"اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو وہ تمہیں اللہ کے ڈر سے جھکا' دبا اور پاش پاش نظر آتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں سے اس لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

کیا ان تفصیلات کے بعد بھی کسی کو قرآن کی اثر انگیزی اور دلکشی میں کوئی کلام ہو سکتا ہے؟ مگر یہ بات بڑی قابل غور ہے کہ جس قرآن کی تاثیر کا یہ حال تھا کہ دشمنوں کی دنیا

بدل جاتی تھی اور کفر و ضلالت پسند طبیعتیں ایمان و ہدایت سے سرفراز ہو جاتی تھیں اور جس کے اثرات کی یہ کیفیت ہو کہ پہاڑ بھی سنیں تو پاش پاش ہو جائیں آج وہ ایک ذہن و دماغ کو بھی اپیل نہیں کر رہا ہے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا' خود مسلمان جو روزانہ اس کی تلاوت کرتے اور نمازوں میں اس کو سنتے ہیں (اور اگر اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی تو یہ اور زیادہ شرمناک بات ہے) لیکن ان کے دلوں میں سوز و گداز اور طبیعتوں میں جوش و ولولہ نہیں پیدا ہوتا اور نہ ان کی ذلتیں اور پستیاں' عظمتوں اور رفعتوں میں تبدیل ہوتی ہیں حالانکہ قرآن تو ہمیں عزت و عظمت بخشنے' امنگ و حوصلہ دینے اور وادیٔ ظلمات سے نکالنے ہی کے لئے آیا تھا۔

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ (الحدید:۹)

"وہی اللہ ہے جو اپنے بندے (محمد ﷺ) پر روشن آیتیں اتارتا ہے تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں کردے اور یقیناً اللہ تم پر بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔"

تو کیا خدا کا یہ قانون بدل گیا ہے؟ نہیں' وہ تو کہتا ہے: "لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا" حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور اس کی دعوت و سعادت اب بھی اپنے اندر پوری کشش اور جاذبیت رکھتی ہے۔ مگر ہمارے دلوں کی سختی و سنگدلی اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ کوئی اثر ہی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

طالبِ لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید
ہچنیں در عمل معدن و کان است کہ بود

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو قرآن مجید ٹھیک ٹھیک طور سے پڑھنے اور اس سے خاطر خواہ اخذ و استفادہ کی توفیق عطا فرمائے' کیونکہ اپنا عقیدہ اور ایمان یہ ہے کہ یہی ان کی اصل متاع اور حقیقی دولت ہے' اس سے تہی دامن ہو کر اگر دنیا جہان کی تمام دولتیں بھی ان کو مل جائیں تو وہ فقیر و گدا ہی رہیں گے۔

سیرت وسوانح

حکیم الاُمّت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

عبدالرشید عراقی

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ولادت ۱۱۱۴ھ میں اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں ہوئی۔ آپ ابھی چار سال کے تھے کہ سلطان اورنگزیب عالمگیر نے انتقال کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ۱۱۷۶ھ میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت شاہ صاحب کی عمر ۶۲ سال تھی۔ اس ۶۲ سال کے دوران سلطان اورنگزیب کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ یہ گیارہ مغل بادشاہ ہر لحاظ سے کمزور ثابت ہوئے اور ملک کی اقتصادی' معاشرتی اور اخلاقی حالت دن بدن روبہ زوال ہوتی گئی۔ اس دور میں ضعیف الاعتقادی اور بدعات کا دور دورہ تھا' جاہلانہ رسومات' شرک کی کثرت' سجدۂ تعظیمی' قبروں پر چادریں چڑھانا' بزرگوں کے نام کی قربانیاں کرنا' مزارات کا طواف' گانا بجانا' چراغاں کرنا اور عقائد فاسدہ وغیرہ کا طویل سلسلہ جاری تھا۔ غرض ۱۲ویں صدی کا ہندوستان سیاسی' انتظامی' اخلاقی اور بہت حد تک اعتقادی حیثیت سے انحطاط و پستی کے اس نقطہ پر پہنچ گیا تھا جو اسلامی ملکوں کے زوال اور مسلم معاشرہ کی پستی کا افسوسناک اور خطرناک مرحلہ ہوتا ہے۔ اس دور کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ ایک مضمون میں اختصار کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> "مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کی مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و حکمت کے ہنگاموں سے پر شور تھا۔ فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق مذہب کا سب سے بڑا

جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معانی و مطالب اور احادیث کے احکامات وارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔" (مقالات سلیمان ج ۲ ص ۴۴)

حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۱ھ میں ۷۷ برس کی عمر میں دہلی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ فضائل حمیدہ اور اخلاق ستودہ کے جامع تھے۔ شجاعت' فراست اور غیرت اسلامی بدرجہ اتم ان میں موجود تھی۔ مجاہدانہ جذبات اور حمیت اسلامی ان میں وراثتہً چلی آرہی تھی۔ غیرت و شجاعت ان کو خاندانی ورثہ میں ملی تھی۔ اور یہی دولت ہے جو ان کی اولاد میں منتقل ہوئی۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے مغل بادشاہ فرخ سیر کے آخری ایام میں ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ کو ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ (انفاس العارفین' ص ۸۳۔۸۵)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ کو قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر اپنے نانہال میں پیدا ہوئے۔ ۵ سال کے تھے کہ آپ کی تعلیم کی ابتداء ہوئی۔ ۷ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اور اس کے ساتھ فارسی اور عربی کے مختصرات پڑھنے شروع کئے۔ ۱۴ سال کے ہوئے تو تفسیر بیضاوی پڑھی۔ ۱۵ سال کی عمر میں حدیث کی تعلیم کا آغاز ہوا اور اپنے والد محترم سے مشکوٰۃ المصابیح' شمائل ترمذی اور صحیح بخاری کتاب الطہارۃ تک پڑھیں۔ ۱۴ سال کے تھے کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی ہوئی۔ اس سے آپ کے بیٹے شیخ محمد پیدا ہوئے' جنہوں نے ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا۔ پہلی بیوی کا انتقال ہوا تو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے دوسرا نکاح سونی پت میں سید ثناء اللہ کی صاحبزادی سے کیا۔ اس زوجہ محترمہ سے آپ کے چار صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین' شاہ عبدالقادر' شاہ عبدالغنی اور ایک صاحبزادی امتہ العزیز پیدا ہوئیں۔ آپ کے چاروں صاحبزادے برعظیم پاک و ہند میں دین کی نشأۃ ثانیہ کے ارکان اربعہ ہیں۔

حج بیت اللہ

حضرت شاہ ولی اللہؒ ۱۱۴۳ھ میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور ۱۱۴۴ھ تک آپ کا قیام حرمین شریفین میں رہا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنے حرمین شریفین کے قیام میں علم حدیث کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور وہاں کے شیوخ اور اکابرین سے' جو دیار و امصار سے وہاں جمع ہوئے تھے' علم حدیث کی تحصیل کی' جو ان کی تجدید و اصلاح کے ایوان بلند میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس سے آپ تحقیق و اجتہاد کے اس مقام پر پہنچے جہاں کوئی دوسرا صدیوں میں نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ ۱۰ رجب ۱۱۴۵ھ جمعہ کے دن صحت و سلامتی کے ساتھ واپس دہلی پہنچے۔ (الجزء اللطیف' ص ۵)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا درس حدیث

حضرت شاہ صاحبؒ نے حجاز سے واپسی کے بعد اپنے والد مکرم حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں حدیث کا درس شروع کیا اور چند ہی دنوں میں آپ کے ہاں طلباء کا ایک جم غفیر جمع ہو گیا اور حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث کی پورے برعظیم میں شہرت ہو گئی۔

وفات

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی ساری زندگی احیاء سنت' قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت' تعلیم و تربیت اور اعلائے کلمۃ الحق میں گزار کر ۶۲ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ میں محرم کی آخری تاریخ کو دہلی میں انتقال کیا اور اپنے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے پہلو میں قبرستان مہدیاں میں دفن ہوئے۔ (تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۵ ص ۱۲۷)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے تجدیدی کارنامے

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے تجدید و اصلاح امت و دین کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ سب سے پہلے آپ نے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ اصلاح عقائد ہے اور اللہ تعالیٰ نے اصلاح عقائد کی طرف قرآن مجید میں

وضاحت سے فرمایا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○
(آل عمران:۱۳۹)

"اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا' اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔"

پھر دوسری جگہ وضاحت سے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ' وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا' يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا' وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (النور: ۵۵)

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے' ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔ اور ان کے دین کو' جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے' مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ بدکردار ہیں۔"

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دور میں مسلمانوں میں ایسی شرکیہ اور جاہلانہ رسوم کی کثرت ہو گئی تھی اور عقائد اور معاشرتی زندگی میں جاہلیت کا خمیر اس طرح رچ بس گیا تھا کہ ان کی اصلاح کی طرف توجہ کرنا بہت ضروری تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی کئی ایک کتابوں میں اس وقت کے مسلمانوں کے عقائد اور اس وقت کے معاشرہ کی تصویر کھینچی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ قرآن مجید کے مطالعہ کی طرف لوگوں کو راغب کیا جائے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ عقائد کی اصلاح صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھی کہ لوگوں کو مطالب قرآن سے آگاہ کیا جائے۔ اس وقت برعظیم کی زبان فارسی تھی۔ شاہ صاحب

نے فارسی میں قرآن مجید کا ترجمہ "فتح الرحمٰن" کے نام سے کیا۔ فارسی زبان اس وقت ملک کی سب سے بڑی زبان تھی' دفتروں کی زبان بھی فارسی تھی' ہر پڑھا لکھا مسلمان اگر اسے بول نہیں سکتا تھا تو اس کو سمجھتا ضرور تھا۔ اس لئے آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ "فتح الرحمٰن" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"یہ زمانہ جس میں کہ ہم لوگ موجود ہیں اور یہ ملک جس کے ہم باشندہ ہیں' اس میں مسلمانوں کی خیر خواہی تقاضا کرتی ہے کہ فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا جائے' تاکہ عوام و خواص یکساں طور پر سمجھ سکیں اور چھوٹے بڑے سبھی معانی قرآن کا ادراک کر سکیں۔ اس لئے اس اہم کام کا داعیہ فقیر کے دل میں ڈالا گیا۔ اور اس کے لئے مجبور کیا گیا۔"

(مقدمہ فتح الرحمٰن مطبوعہ دہلی ۱۲۹۴ھ)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

"الغرض شاہ صاحب نے سفر حجاز سے واپسی کے پانچ سال بعد (غالباً اصلاح عقائد کی ان کوششوں کا نتیجہ دیکھنے کے بعد جو خصوصی درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کے ذریعہ ہو رہی تھیں) یہ فیصلہ کیا کہ ہدایت عام' اصلاح عقائد اور اللہ تعالیٰ سے تعلق و رابطہ پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ قرآن مجید کی ہدایت و تعلیمات کی براہ راست اشاعت و تبلیغ سے زیادہ مؤثر نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا جائے۔"

(تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۵' ص ۱۴۵)

فارسی ترجمۂ قرآن کے بعد کے اُردو تراجم

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ قرآن مجید کے بعد بہت جلد قرآن مجید کے اردو ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ اب فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی۔ چنانچہ فارسی ترجمہ کے ۵۰ سال بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے صاحبزادے مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے قرآن مجید کا بامحاورہ اردو میں ترجمہ کیا۔ اور دوسرے صاحبزادے

مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے اردو میں قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا۔

ان دونوں ترجموں نے اصلاح عقائد خصوصاً عقیدۂ توحید میں درستگی کے لئے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ چنانچہ ان تراجم کی وجہ سے لاکھوں مسلمانوں کے عقائد کی درستگی ہوئی اور جو کام ان اردو تراجم قرآن کی وجہ سے ہوا کوئی اسلامی حکومت بھی اپنے وسائل کے ساتھ دعوت و اصلاح کا اتنا بڑا کام انجام نہیں دے سکتی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دو صاحبزادوں مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے قرآن مجید کے اردو تراجم کے ذریعہ اصلاح عقائد میں اپنے والد بزرگوار کے تجدیدی کارناموں کی تکمیل کی' مگر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے درس قرآن کے ذریعہ اپنے والد بزرگوار کے تجدیدی کارناموں کی تکمیل کی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

> "قرآن مجید کے ان اردو تراجم کے علاوہ جو اسی خاندان والا شان کے دو برگزیدہ افراد حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کئے' اور ہندوستان میں جہاں جہاں اردو بولی جاتی تھی گھر گھر پڑھے جانے لگے' قرآن مجید کے ذریعہ تطہیر عقائد اور اصلاح اعمال و اخلاق کی سب سے طویل' سنجیدہ و عمیق اور مؤثر و وقیع کوشش خاندان ولی اللّٰہی کے سب سے بڑے فرد اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے کاموں کی تکمیل و توسیع کی سعادت حاصل کرنے والے بزرگ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ذریعہ انجام پائی' جنہوں نے تقریباً ۶۲ ـ ۶۳ سال تک دہلی جیسے مرکزی شہر اور ۱۳ویں صدی ہجری جیسے اہم زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کو عوام و خواص میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور اس سے اصلاح عقائد کا جو عظیم الشان کام انجام پایا' ہمارے علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

(تاریخ دعوت و عزیمت' ج ۵' ص ۱۵۰)

مسئلۂ توحید

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اصلاح عقائد اور توحید خالص کی دعوت کے لئے صرف

قرآن مجید کے ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ توحید کی صحیح وضاحت اور شرک کی تمام اقسام پر اپنی کتابوں میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور مشرکین عرب اور اہل جاہلیت کا جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تھا اس کی صراحت کی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق مانتے تھے' خالق ارض و سما مانتے تھے' مگر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو کیوں مشرک گردانا اور قرآن مجید نے ان کو کیوں مشرک کہا؟ اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ اگر حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا عقیدۂ توحید کی تجدید' اس کی تنقیح و توضیح' اس کی اشاعت و ترویج اور اس سلسلہ کی غلط فہمیوں کے رفع کرنے کے سوا کوئی اور کارنامہ نہ ہوتا تو آپ کا تنہا یہی کارنامہ آپ کو مجددین امت میں شمار کرنے کے لئے کافی تھا۔

علمائے اسلام میں آٹھویں صدی ہجری میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور ان کے تلمیذ حافظ ابن القیمؒ نے عقائد کی اصلاح کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ ہماری تاریخ کا ایک زرین باب ہے۔ امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ کے بعد اگر اس سلسلہ میں کسی کا نام پورے اعتماد سے لیا جا سکتا ہے تو وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں جنہوں نے اصلاح امت اور عقائد کی صحیح تشریح و تفہیم سلف صالحین کے مسلک کے مطابق پیش کی۔

(جاری ہے)

بقیہ: پردہ - نفسیات کی روشنی میں

یہ سب باتیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ عورت کو مرد سے چھپایا جائے اور اس کے حسن و جمال کو مستور رکھا جائے۔ عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت کی خاطر "پردہ" سے بہتر کوئی دوسرا نظام تشکیل نہیں دیا جا سکتا۔ عورت کو گھر سے باہر پبلک میں لا کر اور اس کے جسم کو حیا کے لباس سے محروم کر کے باعصمت نہیں رکھا جا سکتا۔ جو مرد نفسیات کی آڑ میں عورت کو مکمل طور پر بے پردہ کرنا چاہتے ہیں درحقیقت وہ اپنے نفس اور ہوس کے غلام ہیں' دھوکہ باز اور مکار ہیں ---- عورت کو ان کے مکروہ جال میں ہرگز نہیں پھنسنا چاہئے!

سورۃ البقرۃ

آیت: ۵۴

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغہ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲: ۵: ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲: ۵: ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲: ۳۴

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ
ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ
فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

۲ : ۳۴ : ۱ اللغــة

[وَاِذْ] کے معانی واستعمال پر ابھی اوپر [۲ : ۳۳ : ۱] میں بات ہوئی تھی۔ اور یہ (وَاِذْ) اگلی آیات میں بھی (البقرہ : ۸۴ تک) بتکرار آئے گا "وَ" کے معانی و استعمالات کی وضاحت کے لیے دیکھیے الفاتحہ : ۵ [۱ : ۴ : ۱ (۳)] اور البقرہ : ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۱)]۔ اور "اِذْ" کے استعمال اور معنی کے لیے دیکھئے البقرۃ : ۳۰ [۲ : ۲۲ : ۱ (۱)]۔

[قَالَ مُوسٰی] "قَالَ" کا مادہ "ق و ل" اور وزن اصلی "فَعَلَ" ہے۔ اصلی شکل "قَوَلَ" تھی جس میں اہل عرب واو متحرک ماقبل مفتوح کو الف میں بدل کر لکھتے اور بولتے ہیں اور یوں "قَوَلَ" سے "قَالَ" ہو جاتا ہے اس مادہ سے فعل مجرد "قال یقول قولاً" (کہنا) ـ کے باب معنی اور استعمال پر البقــرہ : ۸ [۲ : ۷ : ۱ (۴)] میں بات ہو چکی ہے۔ اس فعل مجرد کے متعدد صیغے اس سے پہلے گزر چکے ہیں۔

"موسیٰ" ایک معروف پیغمبر کا نام ہے۔ ویسے اس لفظ (عَلَم) کی اصل کے بارے میں البقرہ: ۵۱ [۲ : ۳۳ : ۱ (۲)] میں وضاحت کی گئی تھی۔ اس طرح "واذ قال موسیٰ" کا ترجمہ ہوا "اور جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے :

۲ : ۳۴ : ۱ (۱) [لِقَوْمِهٖ] یہ لام الجر + قوم + ہ (ضمیر مجرور متصل) کا مرکب ہے۔ اس میں لام (لِ) تو فعل "قال" کے ساتھ استعمال ہونے والا صلہ ہے قال لِ...... = اس نے ...... کو / سے کہا ضمیر (ہ) کا ترجمہ یہاں "اس کی، اپنی" ہے۔ اس طرح "لِقومِہٖ" کا ترجمہ "اپنی قوم سے" یا اپنی قوم کو" بنتا ہے جسے بعض نے "اپنی قوم کے لوگوں سے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔

● لفظ "قَوْمٌ" (جو عبارت میں خفیف اور مجرور آیا ہے) کا مادہ "ق و م" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ یہ مادہ کثیر الاستعمال اور اس کے مشتقات کثیر المعانی ہیں۔ اس مادہ سے فعل مجرد (قام یقوم = کھڑا ہونا) کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ : ۶ [۱ : ۵ : ۱ (۴)] میں اور پھر البقرہ : ۳ [۲ : ۲ : ۱ (۲)] میں اس سے مزید فیہ کے ابواب (استفعال اور افعال) کے ساتھ بحث گزر چکی ہے۔

● لفظ "قَوْم" اس مادہ سے ایک اسم جامد ہے جس کے معنی ہیں : "لوگوں کی ایسی جماعت جن کو کوئی ایسی چیز (یکجا) جمع کرتی ہو جس کی خاطر وہ سب سرگرم عمل ہوں"۔ عربی میں بنیادی طور پر یہ لفظ صرف "مردوں کی جماعت" پر بولا جاتا ہے (اس کی ایک مثال الحجرات : ۱۱ میں ہے)۔ اگرچہ بعض دفعہ اس میں عورت بھی شامل سمجھی جاتی ہے (دیکھئے القاموس للفیروز آبادی)۔ قریبی رشتہ داروں اور حامیوں وغیرہ کو بھی کسی آدمی کی "قوم" کہا جاتا ہے یہ لفظ مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (قرآن کریم میں دونوں استعمال آئے ہیں)۔ ـــــ کبھی

کبھی یہ لفظ (کسی خاص سیاق میں) "اعداء" (دشمنوں) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (مگر یہ استعمال قرآن میں نہیں آیا)

● اگرچہ اس لفظ کی جمع مکسر "اقوام" وغیرہ بھی آتی ہے (قرآن میں نہیں) تاہم خود لفظ "قوم" اسم جمع ہے۔ اور اس کی صفت اسی لحاظ سے آتی ہے۔ مثلاً "قومٌ جاھلون" (جاہل لوگ)۔ اردو میں "قوم" کا ترجمہ لوگ کیا جاسکتا ہے (جو خود اردو میں اسم جمع ہے) اگرچہ خود لفظ "قوم" بھی اردو میں مستعمل ہے۔ آج کل جو اردو لفظ "قومیت" (یعنی nationality) استعمال ہوتا ہے اس کے لیے عربی میں لفظ "الجنس" اور "الجنسیۃ" استعمال ہوتے ہیں۔

● اور کسی ایک ملک میں رہنے والے لوگوں کو "وہاں کی قوم" کہا جاتا ہے مثلاً پاکستانی ایک قوم ہیں اسی طرح مصری، ایرانی (وغیرہ) ایک قوم ہیں تو ان معنی کے لیے عربی لفظ "اُمّۃ" (یا "شَعْب") استعمال ہوتا ہے جس کی جمع "اُمَمٌ" (اور "شعوب") ہوتی ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ (U.N.O) کو عربی میں "الامم المتحدہ" کہتے ہیں حالانکہ لفظ "اقوام" بھی عربی لفظ ہے مگر وہاں یہ لفظ ان معنی کے لیے مستعمل نہیں جس کے لیے ہم اسے اردو میں استعمال کرتے ہیں۔ لفظ "قوم" مختلف صورتوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) میں چار سو کے قریب (۳۸۳) مقامات پر وارد ہوا ہے۔

[یٰقَوْمِ] میں "یا" تو حرف ندا بمعنی "اے" ہے۔ اور "قَوْم" دراصل "قَوْمِی" (میری قوم، میرے لوگ) ہے۔ عرب لوگ کئی دفعہ "یَ" یعنی یائے متکلم مضاف الیہ (مجرور) کو لکھنے اور بولنے میں گرا دیتے ہیں اور اس کے مضاف کے آخر پر صرف کسرہ (ـِ) لکھتے اور بولتے ہیں۔ یہ کسرہ (ـِ) ہی ساقط ہونے والی "یَ" کی نشانی ہوتی ہے۔ لفظ "قوم" پر لغوی بحث ابھی اوپر کی جاچکی ہے۔ یہاں "یا قوم" کا ترجمہ تو ہے "اے میری قوم" جسے بعض نے صرف "اے قوم" ہی رہنے دیا ہے (کیونکہ اس سے پہلے "لقومہ" اپنی قوم سے (کہا) آیا ہے)۔ اور بعض نے خالص اردو محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ "بھائیو!" کیا ہے۔

[اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ] "اِنکم" تو "اِنَّ" (بے شک) اور "کم" (تم) کا مرکب ہے جس کا ترجمہ "تحقیق / بے شک / یقیناً تم نے" ہے۔

[ظَلَمْتُمْ] کا مادہ "ظ ل م" اور وزن "فَعَلْتُمْ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد (ظَلَم یظلِم) کے باب معنی وغیرہ کی وضاحت البقرہ: ۱۷ [۲:۱۳:۱ (۱۰)] میں کی جاچکی ہے۔ یہاں اس کا ترجمہ "تم نے ظلم کیا / نقصان کیا / بڑا نقصان کیا / بڑا ہی ظلم کیا / تباہ کیا" کی صورت میں کیا گیا ہے۔ اس میں "بڑا" اور "بڑا ہی" کا استعمال محاورے کا زور پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

[اَنْفُسَكُمْ] جو اَنفس + کم (تمہارا/تمہاری) ہے۔ اس میں لفظ "اَنْفُسٌ" (جو عبارت میں خفیف اور منصوب ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) کا مادہ "ن ف س" اور وزن "اَفْعُلٌ" ہے۔ یہ ایک جمع مکسر ہے۔ اس کا واحد "نَفْسٌ" بروزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ کے زیر صرف فعل مجرد کے باب و معنی وغیرہ بلکہ لفظ "انفس" کی لغوی بحث اس سے پہلے البقرہ: ۹ [۲: ۸: ۱ (۴)] میں کی جا چکی ہے۔ یہاں اوپر والے فعل "ظلمتم" کے مختلف تراجم کی مناسبت سے "انفسکم" کا ترجمہ "اپنی جانوں پر/اپنا/اپنے اوپر ہی/اپنے اوپر/اپنے تئیں" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

[بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ] یہ "بِ + اتخاذ + کم + العجل" کا مرکب ہے یہاں "باء" (ب) سببیت کے لیے ہے جس کے معنی ہیں: ... کی وجہ سے/کے ذریعے/کے سبب سے۔ "باء" کے مختلف معانی اور استعمال کی بحث "استعاذہ" میں اور پھر البقرہ: ۴۵ [۲: ۳۰: ۱ (۱)] میں ہو چکی ہے [اتخاذ] کا مادہ "ا خ ذ" (یا بقول بعض "ت خ ذ") ہے اور وزن "اِفتعال" ہے یعنی یہ باب افتعال کا مصدر ہے (جو عبارت میں خفیف اور مجرور ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی)۔ اس مادہ (اخذ) سے فعل مجرد کے باب و معنی پر البقرہ: ۴۸ [۲: ۳۱: ۱ (۵)] میں بات ہوئی تھی۔ اور باب افتعال کے فعل (اتخذ یتخذ) کے معنی وغیرہ پر مفصل بحث البقرہ: ۵۱ یعنی [۲: ۳۳: ۱ (۵)] میں کی جا چکی ہے۔ (بنانا، پکڑنا، بنا لینا وغیرہ) [العجل] کے مادہ اور معنی وغیرہ پر ابھی اوپر البقرہ: ۵۱ [۲: ۳۳: ۱ (۶)] میں۔ اس کا ترجمہ "بچھڑا" ہے۔

اس ترکیب (باتخاذکم العجل) کا لفظی ترجمہ تو بنتا ہے "بسبب تمہارے پکڑنے/بنانے بچھڑے کو کے" جس کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ "تمہارا بچھڑے کو بنا لینے کی وجہ سے"، "تمہارا بچھڑے کو اختیار کرنے/مقرر کر لینے کے سبب سے" کیا گیا ہے۔ جسے بعض نے مصدر کی بجائے حال سے ترجمہ کیا ہے "بچھڑے کو بنا کر، ٹھہرا کر"۔ اور بعض نے تفسیری ترجمہ "پوج کر" کر لیا ہے اور بعض نے محاورہ، اختصار (اور تفسیر) کو سامنے رکھتے ہوئے "اپنی گوسالہ پرستی/گوسالہ گیری/سے" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ اس عبارت پر مزید بحث حصہ "الاعراب" میں آئے گی جس سے ان مختلف تراجم میں فرق کی نحوی بنیاد کا پتہ چلے گا۔

۲: ۳۴: ۱ (۲) [فَتُوبُوا] میں ابتدائی فاء (فَ) تو عاطفہ (یعنی پس، اس لیے) ہے۔

اور [تُوبُوا] کا مادہ "ت وب" اور وزن اصلی "اُفْعُلُوا" ہے۔ یہ دراصل "اُتْوُبُوا" تھا جس میں متحرک حرف علت (جو یہاں "وُ" ہے) کی حرکت (ـُ) اس سے ماقبل حرف صحیح (جو یہاں "ت" ہے) کو

دے دی جاتی ہے۔ پھر ابتدائی ہمزۃ الوصل کو (کتابت اور تلفظ دونوں میں) ساقط کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اب "ت" کے متحرک ہو جانے کی بنا پر اس کی ضرورت نہیں رہتی گویا" اُتْوُبُوا = اُتُوبُوا = تُوبُوا (جس کا وزن اب "فُوْلُوا" رہ گیا ہے)

● اس ثلاثی مادہ (توب) سے فعل مجرد "تاب یتوب توبۃً" (توبہ کرنا، باز آنا وغیرہ) کے باب، معنی اور مختلف صلات کے ساتھ استعمال کے بارے میں البقرہ: ۳۷ [۲: ۲۷: ۱(۴)] میں وضاحت کی جا چکی ہے [تُوبُوا] اس فعل مجرد سے فعل امر معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس کا ترجمہ ہے "تم باز آجاؤ / توبہ کرو" جسے بعض مترجمین نے "تم متوجہ ہو / رجوع لاؤ" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے جو اس فعل (تاب یتوب) کے بنیادی معنی (لوٹنا، توجہ کرنا، رجوع کرنا) پر مبنی ہے۔ اس سے فعل امر کی گردان ہو گی تُبْ۔ تُوبا۔ تُوبُوا۔ تُوْبِیْ۔ تُوبا۔ تُبْنَ۔

۲: ۳۴: ۱(۳) [اِلٰی بَارِئِکُمْ] یہ "اِلٰی + بَارِئ + کُمْ" کا مرکب ہے۔ اس میں "اِلٰی" تو یہاں سابقہ فعل (تُوبُوا) کا صلہ ہے "توبوا الی ......= تم توبہ کرو / باز آؤ / متوجہ ہو.... کی طرف / کی جانب / کے آگے"۔ آخری "کُمْ" ضمیر مجرور (یہاں) بمعنی "تمہارا / اپنا" ہے بعض نے یہاں احتراماً "اِلٰی ....." کا ترجمہ ".... کی جناب میں" سے کیا ہے۔

● لفظ "بَارِئِ" (جو عبارت میں مجرور بالجر اور آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف بصورت "بَارِیِ" آیا ہے) کا مادہ "ب ر ء" اور وزن "فاعِلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد مختلف ابواب سے مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً:

(۱) "بَرِئَ یَبْرَأُ بَرَاءَۃً" (سمع سے) کے معنی ہیں: الگ ہونا، خلاصی پانا، بیزار ہونا، بے تعلق ہونا، برکنار ہونا، بری ہونا" ــــ یہ فعل زیادہ تر کسی ناگوار شے مثلاً بیماری، قرض یا عیب سے خلاصی پانے یا کسی آدمی سے الگ ہونے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس پر "مِنْ" کا صلہ لگتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں: "بَرِئَ مِنَ العیبِ / التهمةِ / الدَّیْنِ / المرض / فلانٍ" (وہ عیب / تہمت / قرض / بیماری / فلاں آدمی سے خلاصی پا گیا / الگ ہو گیا)۔ اس الگ یا برکنار یا بے تعلق ہونے والے کو عربی میں "بَرِیْءٌ" (بروزن فَعِیْلٌ) کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا معنوں کے لیے قرآن کریم میں اس سے کوئی صیغہ فعل تو نہیں آیا مگر اس سے مشتق اسم صفت "بَرِیْءٌ" ۱۱ جگہ اور اس کا مصدر "براءۃ" دو جگہ آیا ہے۔ بلکہ "بَرِیْءٌ" ہی کے معنی میں اردو میں لفظ "بری" استعمال ہوتا ہے اسی لیے "برِئَ یبرأُ" کا اردو ترجمہ "بری ہونا" بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور "بَرِیْءٌ" ہی کے ہم معنی لفظ "بَرَاءٌ" (بروزن فَعَالٌ) ہے یہ لفظ بھی قرآن کریم میں آیا ہے (الزخرف ۲۶)۔ اور ان دونوں کلمات (بَرِیْءٌ اور بَرَاءٌ) کی جمع مکسر "بُرَآءُ" (غیر منصرف بروزن فُعَلَاءُ) بھی قرآن

کریم میں آئی ہے (الممتحنۃ: ۴) - اہلِ حجاز خاص طور پر بیماری سے بری (شفایاب) ہونے کے لیے یہی فعل باب "فتح" سے بھی بولتے ہیں مثلاً کہتے ہیں " بَرَأَ من المرضِ' ـــــ اور شاذ یہ فعل باب کرم سے بھی آتا ہے مثلاً 'بَرُؤَ یَبْرُؤُ الرجلُ' کا مطلب ہے " آدمی کا نیک نیت یا کھرا ہونا " ـــــ اس سے تو صفت "بَرِیْءٌ" ہی آئے گی۔

(۲) بَرَأَ..... یَبْرَأُ بَرْءًا (باب فتح سے) بطور فعل متعدی بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی ہیں "... کو پیدا کرنا، .... کو عدم سے وجود میں لانا" بعض اہلِ لغت "خلَق" اور " بَرَأَ " میں یہ فرق کرتے ہیں کہ "خلَق" جاندار بے جان سب چیزوں کے پیدا کرنے کے لیے آتا ہے۔ جب کہ " بَرَأَ " خاص جاندار چیزوں ہی کے بارے میں آتا ہے[۱] ـــــ اس فعل مجرد (باب فتح) سے اور ان معنی میں فعل مضارع معروف کا صرف ایک صیغہ ایک ہی جگہ قرآن کریم میں آیا ہے (الحدید: ۲۲) - البتہ اس سے اسم الفاعل " بَارِئٌ " قرآن میں تین جگہ آیا ہے۔ دو جگہ تو اسی زیر مطالعہ آیت میں اور ایک دفعہ (الحشر: ۲۴) میں بصورت " الباریُ " (معرف باللام) آیا ہے۔

● بعض حضرات نے دوسرے معنی (پیدا کرنا) کی پہلے معنی (الگ کرنا) کے ساتھ یہ مناسبت بیان کی ہے کہ گویا ایک چیز کو نیستی یا عدم سے الگ کر کے ہستی یا وجود کی طرف لایا جاتا ہے[۲]

فعل مجرد کے ایک صیغے کے علاوہ قرآن کریم میں اس مادہ سے بابِ افعال تفعیل اور تفعل سے مختلف صیغہ ہائے فعل ۹ جگہ آئے ہیں۔ اور مختلف مشتق اسماء اور مصادر وغیرہ ۱۲ جگہ وارد ہوتے ہیں۔ ان کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "بارِئ" اس فعل مجرد (بمعنی پیدا کرنا) سے اسم الفاعل ہے اس کا ترجمہ "پیدا کرنے والا" ہے جسے بعض نے "خالق" اور بعض نے "خدا" کی صورت میں ترجمہ کر لیا ہے۔ "اِلیٰ" کا ترجمہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح اس عبارت "الی بارِئکم" کا ترجمہ سابقہ فعل (فتوبُوا) کے ساتھ ملا کر کیا جائے گا یعنی "فتوبوا الی بارِئکم" (پس تم توبہ کرو/ متوجہ ہو/ رجوع کرو اپنے پیدا کرنے والے/ خالق/ خدا کی طرف/ کی جانب/ کی جناب میں) - اس ترجمے کے تمام اجزاء کی لغوی بحث (الگ الگ) اوپر گزر چکی ہے۔

۲:۵۴:۱(۴) [فَاقْتُلُوْا] ابتدائی فاء (فَ) عاطفہ (بمعنی "اس لیے") ہے "فاء" (فَ) کے معنی اور استعمال کی وضاحت البقرہ: ۲۲ [۲:۱۶:۱(۱۰)] میں کی جا چکی ہے۔

---

[۱] مدالقاموس یعنی "E.W.Lane's Lexicon" [۲] قاموس قرآن ج ا ص ۱۷۴۔

اور "اُقْتُلُوْا" کا مادہ "ق ت ل" اور وزن "اُفْعُلُوْا" ہے یعنی یہ اس مادہ سے فعل مجرد کا صیغۂ امر (جمع مذکر حاضر) ہے جس کا ابتدائی مضموم ہمزۃ الوصل "فائے عاطفہ" سے ملاتے وقت تلفظ سے ساقط ہو جاتا ہے (اگرچہ کتابت میں موجود رہتا ہے)۔

اس مادہ سے فعل مجرد "قَتَلَ .... یَقْتُلُ قَتْلاً (نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "....کو مار ڈالنا، ....کو قتل کرنا" (لفظ "قتل" اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے)۔ یہ مادہ اور اس سے اَفعال اور دیگر مشتقات قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً صرف فعل مجرد سے اَفعال کے مختلف صیغے ۸۰ سے زائد جگہ آئے ہیں۔ اور مزید فیہ کے ابواب تفعیل، مفاعلہ اور افتعال سے مختلف صیغہ ہائے فعل ۶۱ جگہ اور مختلف مصادر اور اسمائے مشتقہ و جامدہ ۲۵ جگہ وارد ہوئے ہیں۔ ان سب کا بیان اپنی اپنی جگہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

"فاقتلوا" کا ترجمہ "قتل کرو، مارو، مار ڈالو، ہلاک کرو" کیا گیا ہے بعض نے اس کا ترجمہ "کھودو" سے کیا ہے جو مبہم بھی ہے اور لفظ سے ہٹ کر بھی ہے۔

[اَنْفُسَكُمْ] کے معنی وغیرہ ابھی اوپر ۲:۳۴:۱(۱) کے بعد اور ۲:۳۴:۱(۲) سے پہلے بیان ہو چکے ہیں (ظلمتم انفسکم کے ضمن میں دیکھئے)۔ جب کوئی مادہ پہلی دفعہ آتا ہے (اسم کی صورت میں ہو یا فعل یا حرف کی شکل میں) تو اس کے ساتھ قطعہ بندی کا حوالہ نمبر دے کر اس پر لغوی بحث وہیں کر لی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس مادہ سے جو بھی کلمہ آتا ہے اس پر حوالہ نمبر نہیں دیا جاتا بلکہ اس سے ماقبل صرف ایک لکیر ڈال دی جاتی ہے ایسے کلمات کے لیے گزشتہ حوالے کی ضرورت پر اس سے ماقبل اور مابعد والے حوالے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے یہاں "انفسکم" کے لیے کیا گیا ہے۔ ویسے "ن ف س" مادہ پہلی دفعہ البقرہ: ۹ یعنی [۲:۸:۱(۴)] میں سامنے آیا تھا۔

● زیر مطالعہ عبارت میں "انفسکم" کا ترجمہ گزشتہ فعل "فاقتلوا" (قتل کرو) کے ساتھ ملا کر کیا جائے گا یعنی "اپنی جانوں کو" یا "اپنی جانیں"۔ بعض مترجمین نے غالباً مضمون کی وضاحت (یا تفسیر) کے پیش نظر اس کا ترجمہ "بعض آدمی بعض کو" اور "اپنے لوگوں کے ہاتھوں اپنے تئیں" کی صورت میں ترجمہ کیا ہے۔ جب کہ بعض نے اس کا ترجمہ "اپنے اشخاص کو" کیا ہے جو اصل سے بھی بھاری بھرکم ہے۔

۱:۳۴:۱(۵) [ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ] یہ ایک جملہ اسمیہ ہے جس کا مبتدأ "ذٰلکم" دراصل "ذٰلِكَ" ہی ہے (بمعنی "وہ") جس پر کافِ خطاب کا اضافہ ہو گیا ہے اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور [خَيْرٌ] کا مادہ "خ ی ر" اور وزن "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "خَارَ یَخِیْرُ خَیْرًا" (ضرب سے)

آتا ہے اور یہ لازم متعدی دونوں طرح مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً "خارَ الرجلُ" (لازم) کے معنی ہیں۔ خیر والا ہونا، اچھے حالات میں ہونا، سازگار ہونا " اور "خار الرجلَ علی ....: (متعدی) کے معنی: ... آدمی کو .... پر فضیلت دی ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے کوئی صیغہ فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب اِفتعال اور تفعّل سے مختلف صیغہ ہائے فعل کل ۱۶ جگہ آتے ہیں۔ اور اس مادہ سے ماخوذ اور مشتق مصادر اور اسماء وغیرہ بکثرت (۱۹۰ جگہ) آئے ہیں جن میں خود ہی لفظ (خَیر) مختلف صورتوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) ۱۷۶ جگہ وارد ہوا ہے۔

● یہ لفظ (خَیر) دراصل اس مادہ (خ ی ر) سے اَفعل التفضیل ہے یعنی یہ دراصل "اَخیَرُ" تھا۔ مگر یہ لفظ عربی زبان میں اسی شکل (خیر) میں (لفظ "شرٌّ" کی طرح اور اس کے مقابلے پر) افعل التفضیل کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "ذٰلک خیرٌ من ھذا" (وہ اس سے زیادہ اچھا ہے) اور "خیر الراحمین" (رحم کرنے والوں میں سے سب سے اچھا)۔ جب لفظ "خیر" افعل التفضیل کے معنی میں استعمال ہو تو اس کا اُردو ترجمہ "بہتر، زیادہ بہتر، زیادہ اچھا، خوب تر" سے کیا جا سکتا ہے۔

● افعل التفضیل (Superlative degree) کے علاوہ لفظ "خَیرٌ" عام اسم یا مطلق صفت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی "بھلائی نیکی، مال دولت، کامل خیر، اچھا، عمدہ، خوشگوار" ہوتے ہیں بلکہ بقول راغب اصفہانی ہر وہ شے جس کی طرف رغبت اور میلان سب میں پایا جاتا ہو، جو مرغوب اور دل پسند ہو وہ "خیر" ہے۔ جیسے حکمت کو (قرآن میں) "خیر کثیر" کہا گیا ہے ———— "خَیرٌ" کی جمع "اخیار" بمعنی "اچھے لوگ" قرآن کریم میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ اور اسی معنی میں اس کی جمع "خِیار" بھی آتی ہے جو اگرچہ قرآن میں تو نہیں آئی مگر احادیث نبویہ میں استعمال ہوتی ہے۔

● لفظ "خَیر" جب افعل التفضیل کے طور پر نہیں بلکہ مطلقاً صفت (اچھا، عمدہ، بھلا کے معنی میں) ہو تو مؤنث کے لیے اس کے آخر پر تائے تانیث (ۃ) بھی لگا لیتے ہیں اور "خَیرۃٌ" ہی کی جمع "خیراتٌ" آتی ہے (یعنی اچھے کام۔ اچھی باتیں) اور اسی سے "خیراتٌ حِسانٌ" (الرحمٰن: ۷۰) بمعنی "اچھی خوبصورت عورتیں" آیا ہے۔ اگر تفضیل کے معنی میں ہو تو "خیرۃ الناس" کہنا غلط ہے بلکہ "فلانۃ خیرُ الناس یا خیرُ النساءِ" (فلاں عورت سب مردوں یا عورتوں سے بہتر / زیادہ اچھی ہے) کہیں گے۔ اسی طرح یہ لفظ بصورت "اَخیَرُ" (جو اس کی اصل شکل تھی) بھی استعمال نہیں ہوتا اور "خیر" کا تثنیہ یا جمع بھی عموماً استعمال نہیں ہوتا کیونکہ یہ زیادہ بمعنی "افعلُ من ...." ہی استعمال ہوتا ہے۔

● زیر مطالعہ عبارت میں لفظ "خَیْرٌ" بطور افعل التفضیل ہی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ "بہتر" سے ہی کیا گیا ہے اگرچہ یہاں اسے عام اسم صفت بھی سمجھا جا سکتا ہے [لَکُمْ] (جو لام الجر + ضمیر مجرور "کُمْ" ہے) کا ترجمہ تو بنتا ہے "تمہارے لیے" جسے بعض مترجمین نے "تمہارے حق میں" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے یوں اس پورے جملے "ذٰلکم خیرٌ لکم" کا ترجمہ "وہ/یہ بہتر ہے تمہارے لیے/تمہارے حق میں" کی صورت میں ہو سکتا ہے

۲:۳۴:۱(۶) [عِندَ بَارِئِکُمْ] "بارئکم" ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

یعنی [۲:۳۴:۱(۳)] میں۔ جس کا ترجمہ "تمہارا پیدا کرنے والا" ہے [عِنْدَ] کا مادہ "ع ن د" اور وزن "فِعْلَ" ہے۔ یہ لفظ بطور اسم معرب (عِنْدٌ) شاذ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس مادہ سے فعل مجرد "عَنَدَ یعنِدُ عَنودًا" (نصر، سمع، ضرب اور کرم سے) آتا ہے اور اس کے معنی "دور جانا، مڑ جانا، پھر جانا (جانتے بوجھتے حق کی مخالفت کرنا) کہتے ہیں "عَنَدَ فلانٌ (فلاں نے دانستہ حق کی مخالفت کی)، عربی زبان میں اس مادہ سے مزید فیہ کے ابواب مفاعلہ، افتعال وغیرہ سے بھی مختلف معانی کے لیے افعال استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کا کوئی صیغۂ فعل استعمال نہیں ہوا البتہ صرف اسم صفت "عَنِیْدٌ" چار جگہ آیا ہے جو بلحاظ معنی مذکورہ بالا فعل مجرد سے ہی مشتق ہے ــــــ اسی مادہ سے ایک لفظ "عِناد" (جو باب مفاعلہ کا ایک مصدر ہے) اردو میں بھی اپنے اصل عربی معنی (شدید مخالفت اور دشمنی) کے ساتھ مستعمل ہے۔

● "عِنْدَ" بنیادی طور پر ظرف مکان کے لیے بطور اسم ہے اور یہ ہمیشہ مضاف ہو کر استعمال ہوتا ہے (اسی لیے اس پر تنوین نہیں آتی) اور بوجہ ظرفیت ہمیشہ منصوب آتا ہے۔ (اسی لیے اس کی "د" مفتوح آتی ہے) اس کے بنیادی معنی "۔۔۔۔ کے پاس ہیں" اور یہ حاضر اور غائب چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "عندی مصحف" (میرے پاس ایک نسخۂ قرآن ہے) کا مطلب (۱) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصحف اس وقت میرے پاس موجود ہے اور (۲) یہ بھی کہ میرے گھر میں ہے یعنی میری ملکیت میں ہے ــــــ بعض دفعہ یہ ظرف زمان کے طور پر بھی آتا ہے مثلاً "عندَ الفجر" (فجر کے قریب)۔ اس سے پہلے "مِنْ" (حرف الجر) بھی لگتا ہے اور یہ مجرور ہو کر استعمال ہوتا ہے (معنی وہی ظرف والے رہتے ہیں) مثلاً "مِنْ عندِہٖ" (اس کے پاس سے، اس کی طرف سے)۔ "مِنْ" کے علاوہ دوسرا کوئی حرف جر اس سے پہلے نہیں آتا مثلاً "ذھبتُ الی عندہ" کہنا بالکل غلط ہے (جو بعض جاہل عرب عوام بولتے ہیں) اس کی بجائے "ذھبتُ الیہ" (میں اس کے پاس گیا) کہنا چاہیے۔

● بلحاظ موقع استعمال "عندَ" مختلف مفہوم دیتا ہے۔ اگرچہ سب کی بنیاد "قرب" (پاس ہونا) ہی ہے مثلاً (۱) خیال اور اعتقاد کے لیے۔ جیسے کہیں "عِنْدی کَذا" (میرے نزدیک/میرے خیال اور اعتقاد کے مطابق "یوں" ہے)؛ (۲) ملکیت کے مفہوم کے لیے۔ جیسے "عِنْدی مالٌ" (میرے پاس مال ہے یعنی میں مال رکھتا ہوں) (۳) "فیصلہ کے مفہوم میں ـــــ مثلاً عندی ھذا افضل من ھذا (میرا فیصلہ ہے کہ یہ اس سے اچھا ہے) (۴) رضا کاری کے مفہوم کے لیے مثلاً "فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ" (القصص: ۲۷) "یعنی اگر تو دس برس پورے کر دے تو یہ تیری مہربانی یا رضا کارانہ (بلا جبر) ہوں گے۔"

اردو میں ان تمام مواقع استعمال کے لحاظ سے "عِنْدَ" کا ترجمہ (۱) . . . کے پاس (۲) . . . کے ہاں (۳) . . . . کے نزدیک (۴) . . . . کے خیال میں (۵) . . . کے لگ بھگ کی صورت میں کیا جا سکتا ہے اور "مِن عندِ" . . . . کا ترجمہ حسب موقع (۱) ". . . کی طرف سے" ". . . کی جانب سے" (۲) ". . . کے پاس سے" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

● عربی زبان میں "عِندَ" کے ہم معنی اور اسی کی طرح اضافت کے ساتھ بطور ظرف استعمال ہونے والے دو اور اسم (ظرف) "لَدَیٰ" اور "لَدُنْ" ہیں۔ بظاہر ان کا ترجمہ بھی ". . . . کے پاس" ہی کیا جا سکتا ہے مگر مفہوم اور استعمال میں قدرے فرق ہوتا ہے۔ "لدی" کا تلفظ اسم ظاہر یا ضمیر کی طرف مضاف ہوتے وقت مختلف ہوتا ہے اور "لدُن" کسی غیر حاضر یا غیر موجود (غائب) چیز کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مزید تفصیل ان الفاظ کے اپنے موقع پر آئے گی۔

● اس طرح یہاں "عندَ بارئکم" کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے "تمہارے خالق / پیدا کرنے والے کے نزدیک" سے ہی کیا ہے اگرچہ بعض نے صرف ". . . کے پاس یا . . . کے ہاں" سے بھی ترجمہ کیا ہے۔

۲:۳۴:۱(۷) [فَتَابَ عَلَيْكُمْ] یہ جملہ فعلیہ "فَ" (پس، اس کے بعد) + تَابَ (جن پر ابھی بات ہو گی + علی (پر) + کُمْ (تم) کا مرکب ہے۔

اس میں "تابَ" کا مادہ "ت و ب" اور وزن اصلی "فَعَلَ" ہے۔ یہ دراصل "تَوَبَ" تھا جس میں واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل کر لکھی اور بولی جاتی ہے اور "تَابَ" ہو جاتا ہے۔ اب اس کا وزن "فَالَ" رہ گیا ہے۔

● اس مادہ سے فعل مجرد "تاب یتوب توبة" کے باب معنی اور استعمال پر البقرہ: ۳۷ [۲:۲۷:۱(۴)] میں مفصل بات ہوئی تھی۔ وہاں یہ بھی بیان ہوا تھا کہ فعل "تابَ الیٰ . . . . ." کے معنی "بندے کا رب کے سامنے) توبہ کرنا" اور "تابَ علی . . . . کے معنی "اللہ کا (بندے کی) توبہ قبول فرمانا" ہوتے ہیں۔ آیت

زیر مطالعہ میں" تاب" کے یہ دونوں استعمال آ گئے ہیں۔ابھی اوپر [۲:۳۴:۱(۲)] میں آپ اس فعل کا" اِلی" کے ساتھ استعمال دیکھ آئے ہیں (فتوبوا الی ....میں)۔ اور اب یہاں (" فتاب علیکم" میں) "علی" کے ساتھ اس کے استعمال کی مثال سامنے آئی ہے۔اس طرح" فتاب علیکم" کا ترجمہ ہوا" پس اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی / تم پر توجہ فرمائی" ــــ" تاب یتوب" کے ان دونوں استعمالات کا فرق اور ہر ایک کا ترجمہ ذہن میں رکھیے۔ یہ فعل آگے چل کر بکثرت (ساٹھ سے زیادہ جگہ) سامنے آتے گا ــــ خیال رہے کہ جب اس فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ (یا اس کے لیے کوئی ضمیر) ہو تو" علی" کا صلہ ضرور مذکور ہوتا ہے۔مگر جب یہ فعل کسی بندے (یا اس کے لیے کسی ضمیر فاعل) کے ساتھ آئے تو بعض دفعہ "الی" کا صلہ محذوف بھی ہوتا ہے۔دراصل وہاں" الی اللہ" ہی مراد ہوتا ہے۔

۲:۳۴:۱(۸) [اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ] اس میں ابتدائی حصہ [انہ ھو] تو" اِنَّ" (بے شک یا یقیناً) + "ہٗ" (وہ) + "هُوَ" (وہ) کا مرکب ہے اس میں دو ضمیروں کے آجانے کی وجہ سے"...یہ هُوَ" کا ترجمہ" وہ ہی تو، وہی تو" سے کیا جائے گا۔اس پر مزید بات" الاعراب" میں آئے گی۔

[الرَّحِيْمُ] بمعنیٰ" مہربان، نہایت مہربان یا رحم والا" کے مادہ، معنی وغیرہ پر الفاتحہ: الیعنی [۱:۱:۱(۳)] میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔

[التَّوَّابُ] جو عبارت میں" الرحیم" سے پہلے ہے تاہم" الرحیم" کی لغوی بحث کے لیے سابقہ حوالہ کا اشارہ کافی تھا اس لیے اسے پہلے کر دیا گیا ہے اور لفظ" التواب" چونکہ ذرا وضاحت طلب ہے اور یہاں پہلی دفعہ آیا ہے اس لیے اس کی لغوی بحث بعد میں کی جا رہی ہے۔

اس لفظ (التَّوَّابُ) کا مادہ" ت و ب" اور وزن (لام تعریف نکال کر)" فَعَّالٌ" ہے۔اس مادہ سے فعل مجرد کے معانی وغیرہ البقرہ: ۳۷ [۲:۲۷:۱(۴)] میں بیان ہو چکے ہیں۔(اور آیت زیر مطالعہ میں بھی اس سے دو صیغہ ہائے فعل آ چکے ہیں) لفظ" توّابٌ" اس مادہ (یا فعل مجرد) سے اسم مبالغہ کا صیغہ ہے اور فعل تاب الی .... اور تاب علی .... کے دونوں معنی (توبہ کرنا، توبہ قبول کرنا) کے لحاظ سے اس لفظ (توّاب) کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں یعنی (۱) بار بار یا بکثرت توبہ کرنے والا اور (۲) بار بار یا بکثرت توبہ قبول کرنے والا۔

● یعنی یہ اسم صفت اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے اور قرآن کریم میں دونوں استعمال موجود ہیں۔قرآن کریم میں یہ لفظ بندوں کی صفت کے طور پر صرف ایک جگہ (البقرہ: ۲۲۲) بصورت جمع مذکر سالم (التَّوَّابِيْنَ) آیا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے لیے صفت کے طور پر یہ لفظ (بصورت معرفہ یا نکرہ) کل گیارہ جگہ آیا ہے۔ ان میں سے صرف ایک جگہ (النصر:۳) اکیلا "تَوَّابًا" آیا ہے باقی ۹ جگہ یہ کسی دوسری صفت کے ساتھ مل کر آیا ہے۔ اور زیادہ تر یہ "رحیم" کے ساتھ مل کر استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ۶ جگہ تو "التواب الرحیم" ہی آیا ہے (جن میں سے ایک یہ زیر مطالعہ آیت ہے)۔ ایک جگہ "تواب رحیم" دو جگہ "توابًا رحیمًا" آیا ہے اور صرف ایک جگہ "تواب حکیم" آیا ہے۔

● اس (تواب) کے اردو ترجمہ میں اسم مبالغہ کی وجہ سے "بڑا" یا "بہت" لگانا ضروری ہے اگرچہ بعض نے اس کا ترجمہ عام اسم صفت کی طرح بھی کر دیا ہے اس طرح "التواب" کا ترجمہ عموماً تو "بڑا توبہ قبول کرنے والا، بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا معاف کرنے والا" کی صورت میں کیا گیا ہے بعض نے صرف "پھر آنے والا، معاف کرنے والا، توبہ قبول فرمانے والا" سے ترجمہ کیا ہے جس میں اسم مبالغہ کا مفہوم مفقود ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ احتراماً "توبہ قبول کرتے ہیں" سے کیا ہے مگر یہ لفظ سے ہٹ کر ہے اس لیے کہ "تواب" صیغۂ فعل تو نہیں ہے۔ اسے صرف محاورے اور مفہوم کی بنا پر ہی درست کہا جا سکتا ہے۔

۲:۳۴:۲ الاعراب

زیر مطالعہ آیت دراصل تو سات چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے بعض جملوں کو فائے عاطفہ کے ذریعے باہم ملا دیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلے (۱) جملہ فعلیہ (واذ قال موسیٰ لقومہ) میں بنیادی فعل "قالَ" ہے۔ اس کے بعد جملہ ۲ تا ۵ (جیسا کہ آگے بیان ہوگا) اس فعل "قال" کے مفعول (یعنی مَقُول یا حکایۃ بالقول) کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا ان سب کو محلاً منصوب کہا جا سکتا ہے اس کے بعد جملہ ۶ اور ۷ کا تعلق اس "قال" سے نہیں ہے بلکہ وہ دو الگ خبریہ جملے ہیں۔ ہر ایک جملے کی الگ الگ ترکیب نحوی اور اعراب کا بیان یوں ہے۔

① وَاِذ قال موسیٰ لقومہ

[وَ] کے ذریعے بعد کے جملے کو سابقہ جملے پر عطف کیا گیا ہے۔ یہاں ایسے متعدد جملے ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ [اِذْ] ظرفیہ ہے اور یہ ایک فعل محذوف (اذکروا) کا ظرف ہے [قال] فعل ماضی معروف ہے اور [موسیٰ] اس (فعل قال) کا فاعل (لہٰذا) مرفوع ہے جس میں بوجہ اسم مقصور ہونے کی علامت رفع ظاہر نہیں ہے۔

[لقومہ] لام الجر فعل "قال" کا صلہ ہے جو مخاطب سے پہلے لگتا ہے اور "قومہ" مرکب اضافی

ہے جس میں "قوم" مضاف (اور خفیف ہے) اور ضمیر "ہ" مضاف الیہ ہے اور یہ مرکب اضافی (قومہ) مجرور بالجر (لِ) ہے علامت جر "م" کی کسرہ (ــِ) ہے اور یہ سارا مرکب جاری (لقومہ) متعلق فعل "قالَ" ہے۔ یہاں تک ابتدائی (ایک لحاظ سے نامکمل) جملہ پورا ہوتا ہے جس کے بعد اگلے جملے مقول یعنی فعل "قال" کے مفعول کے طور پر آتے ہیں۔

(۲) یاقوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل؛

(یا) حرف ندا اور [قومِ] منادی مضاف (لہٰذا) منصوب ہے مگر یائے متکلم کی طرف مضاف ہونے کے باعث اس (قومی) میں علامتِ نصب میم کی (جو فتحہ (ــَ) تھی) "گم" ہوگئی ہے۔ اور خود یائے متکلم کو بغرض اختصار کتابت اور تلفظ میں حذف کر دیا گیا ہے اب اس یائے متکلم (مضاف الیہ مجرور) کی علامت "قومِ" کی میم کی کسرہ (ــِ) رہ گئی ہے۔ [انکم] "اِنَّ" حرف مشبہ بالفعل اور "کُمْ" ضمیر منصوب متصل اس کا اسم ہے۔ [ظلمتم] یہ پورا جملہ فعلیہ ہے [فعل ماضی اور ضمیر فاعلین "انتم" مستتر مل کر] اور یہ (جملہ فعلیہ) "اِنَّ" کی خبر ہے لہٰذا اسے محلاً مرفوع کہہ سکتے ہیں۔ [انفسکم] مضاف (انفس) اور مضاف الیہ (کم) مل کر فعل "ظلمتم" کا مفعول (لہٰذا) منصوب ہے۔ علامتِ نصب اس میں "انفس" کے "س" کی فتحہ (ــَ) ہے۔ "انفس" آگے مضاف ہونے کی وجہ سے خفیف بھی ہے ـــ [باتخاذکم] میں "باء" (بِ) حرف الجر ہے اور "اِتخاذِ" مجرور اور آگے مضاف (لہٰذا خفیف) بھی ہے اور ضمیر مجرور "کُمْ" مضاف الیہ ہے۔ اور یہ مرکب اضافی (اتخاذکم) مجرور بالجر (بِ) ہے۔ اور یہ سارا مرکب جاری (باتخاذکم) متعلق فعل (ظلمتم) ہے [العجلَ] یہ مصدر "اتخاذ" کا مفعول بہ واقع ہوا ہے۔ اس لیے منصوب ہے۔ علامتِ نصب آخری "لام" کی فتحہ (ــَ) ہے۔ (کیونکہ العجل معرف باللام بھی ہے)۔ یہاں مصدر نے فعل کا سا عمل کیا ہے۔ (مصدر اور بعض اسمائے مشتقہ اسم الفاعل اسم المفعول وغیرہ فعل کا سا عمل کرتے ہیں) گویا تقدیر عبارت یوں ہے "بِ(مَا) اتخذتم العجلَ" (بسبب اس کے جو پکڑا تم نے بچھڑے کو)۔ عبارت میں "اتخاذ" کا دوسرا مفعول (الٰھًا) محذوف (غیر مذکور) ہے۔ جو سیاق قصہ (تفسیر) سے معلوم ہوتا ہے۔ اس عبارت (باتخاذکم العجلَ) میں "اتخاذ" کا "مصدری ترجمہ" اور "مفعول ثانی" کے ذکر کے ساتھ ترجمہ "حصہ اللغۃ" میں بیان ہو چکا ہے دیکھئے ۲:۳۴:۱(۱) اور ۲:۳۴:۱(۲) کے درمیان یہ پورا جملہ (یاقوم.....العجلَ) اپنے سے سابقہ جملے (۱) "قال" موسیٰ" کا مفعول بہ (مقول) ہو کر محلاً منصوب ہے۔

(۳) فتوبوا الی بارئکم

[فَ] عاطفہ سببیہ ہے (بمعنی لہٰذا، اس لیے) [توبوا] فعل امر صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے۔ [الی بارئکم] میں "الی" حرف الجر ہے جو در اصل یہاں فعل "توبوا" کا صلہ ہے اور "بارئکم" مضاف (بَارِئ۔ جو مجرور بالجر بھی ہے اور بوجہ آگے مضاف ہونے کے خفیف بھی ہے) اور مضاف الیہ (کم) مل کر مجرور بالجر (الی) ہیں۔ اور یہ مرکب جاری (الی بارئکم) متعلق فعل "توبوا" ہے (یعنی تم توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی جناب میں)

④ فاقتلوا انفسکم

یہاں بھی فاء [فَ] عاطفہ اور بلحاظ مفہوم تعقیب کے لیے ہے یعنی "توبہ" کے فوراً بعد یہ کام کرو۔ اس طرح (فَ) کے بعد والا جملہ سابقہ جملہ (توبوا۔۔۔۔) پر عطف ہوتا ہے۔ اور [اُقتلوا] فعل امر مع ضمیر فاعلین "انتم" ہے۔ "فاقتلوا" میں "اُقتلوا" کا ابتدائی ہمزۃ الوصل فائے عاطفہ کی وجہ سے تلفظ سے ساقط ہو جاتا ہے اگرچہ کتابت میں موجود رہتا ہے۔ [انفسکم] مضاف (انفس) اور مضاف الیہ (ضمیر مجرور "کم") مل کر فعل "اقتلوا" کا مفعول بہ (لہٰذا) منصوب ہے علامتِ نصب "انفس" کی "س" کی فتحہ (ـَ) ہے ——— اور یہ دونوں جملے (۳، ۴ مندرجہ بالا) بذریعہ "فا" (فَ) سابقہ (مفعول یعنی مقول) جملے پر عطف ہیں لہٰذا یہ بھی محلاً منصوب ہیں۔

⑤ ذلکم خیر لکم عند بارئکم

[ذلکم] اسم اشارہ مبتدا (مرفوع) ہے جس میں بوجہ مبنی ہونے کے کوئی ظاہر اعرابی علامت نہیں ہے۔ [خیرٌ] اس (اشارہ) کی خبر مرفوع ہے علامتِ رفع "ر" پر تنوین رفع (ٌ) ہے [لکم] لام الجر ("لِ" جو ضمیر کے ساتھ مفتوح آتی ہے) اور "کم" ضمیر مجرور ہے یہ مرکب جاری (لکم) متعلق خبر (خیرٌ) ہے یعنی خبر کی وضاحت ہے کہ "کیسے اور کس کے لیے" خیر (اچھا) ہے۔ [عندَ] ظرف مکان مضاف ہے لہٰذا منصوب ہے اور علامتِ نصب "د" کی فتحہ (ـَ) ہے [بارئکم] مضاف ("بارئ") اور مضاف الیہ (ضمیر مجرور "کم") مل کر ظرف مکان "عند" کا مضاف الیہ ہے۔ اس لیے "بارئِ" مجرور بالاضافہ ہے علامت جر "بارئ" کے آخری "ء" کی کسرہ (ـِ) ہے اور یہاں یہ (بارئِ) آگے مضاف ہونے کے باعث خفیف (لام تعریف اور تنوین سے معرّی) بھی ہے۔ اور یہ مرکب (عند بارئکم) بھی دوسرا متعلق خبر ہے یعنی یہ "خیر" کی ایک دوسرے پہلو سے وضاحت ہے ——— یہاں تک (۲، ۳، ۴، ۵ مل کر) مقول یعنی فعل "قال موسیٰ" (۱) کا مفعول مکمل ہوتا ہے۔ یعنی یہاں تک "قول موسیٰ" (علیہ السلام) تمام ہوتا ہے۔ اس لحاظ

سے ۱ تا ۵ ایک ہی مربوط جملہ ہے۔

⑥ فتاب علیکم

[فَتَابَ] میں فاء [فَ] ایک محذوف فعل پر عطف ہے یعنی تقدیر (دراصل) عبارت یوں بنتی ہے "ففعلتم ما اُمرکم" (پس تم نے اس کے حکم کی تعمیل کی) پس ..... اور [تاب] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب جس میں ضمیر فاعل "ھو" مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور [علیکم] جارّ (علی) اور مجرور (کم) مل کر متعلق فعل "تاب" ہے۔ یا یوں کہیے کہ "علی" فعل (تاب) کا صلہ ہے اور "کُم" اس کا مفعول بہ ہے یعنی "علیکم" محلاً منصوب ہے۔ یہ (فتاب علیکم) سابقہ جملوں (۱ تا ۵) سے الگ جملہ خبریہ ہے یعنی اس کا فعل "قال موسی" کے مقول یا مفعول بہ سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ ابتدائی "واِذ" کے ساتھ اس کا تعلق بنتا ہے۔

⑦ انہ ھوالتواب الرحیم

[انہ] میں "انّ" حرف مشبہ بالفعل بمعنی "بے شک" اور "ہ" ضمیر منصوب بمعنی "وہ" اس کا اسم ہے [ھو] ضمیر فاصل ہے جس کا زور اردو ترجمہ میں "ہی" سے ظاہر ہوتا ہے اور [التواب] "انّ" کی خبر اول اور [الرحیم] اس کی خبر ثانی ہے ——— اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "ھو" مبتداء ہے اور "التواب الرحیم" اس کی دو خبریں ہیں اور خبر کے معرفہ ہونے کی وجہ سے بھی اردو ترجمہ میں "ہی" لانا ہوگا۔ اور یہ سب (ھوالتواب الرحیم) جملہ اسمیہ ہو کر (انہ کے) "انّ" کی خبر ہے یہ ساری عبارت (انہ .... الرحیم) ایک الگ مستقل جملہ خبریہ ہے یعنی اس کا آیت کے سابقہ حصے سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اس سے پہلے جملے (فتاب علیکم) کے بعد وقف مطلق کی علامت (ط) ڈالی گئی ہے اس جملے (۷) کے الگ الگ اجزاء پر لغوی بحث مع لفظی ترجمہ اوپر ۲:۳۴:۱ (۸) میں گزر چکی ہے جس کی مدد سے آپ بلحاظ ترکیب نحوی اس جملے کا اردو ترجمہ کر سکتے ہیں۔

۲:۳۴:۳ الرسم

زیر مطالعہ آیت کے قریباً تمام کلمات (جو ۲۵ سے زائد ہیں) کا قرآنی اور املائی رسم الخط یکساں ہے صرف دو کلمات غور طلب ہیں: "یقوم" اور "ذلکم"

① یقوم: جس کا رسم املائی "یا قوم" ہے قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (یہ لفظ قرآن میں ۴۷ جگہ آیا ہے) بحذف الف بعد الیاء (یقوم) لکھا جاتا ہے۔ بلکہ علم الرسم کا یہ قاعدہ ہے کہ ندا کا حرف "یا" جہاں بھی قرآن کریم میں آیا ہے اس کے ساتھ الف نہیں لکھا جاتا۔ البتہ پڑھا ضرور جاتا ہے جیسے

بذریعہ ضبط ظاہر کیا جاتا ہے[1] جیسے "یموسی' ینوح' یرب" وغیرہ میں۔

(۲) "ذلکم" (اور اس قسم کے دیگر اشارات ذلک، ذلکن وغیرہ بھی) قرآن کریم میں ہر جگہ بحذف الف بعد الذال لکھے جاتے ہیں[2] بلکہ ان کا عام رسم املائی بھی یہی (بحذف الف) ہے عام عربی میں "ذالک یا ذالکم" باثبات الف لکھنا غلط ہے یوں سمجھئے کہ اس لفظ (ذلکم) کی املاء عام رسم املائی پر رسم قرآنی یا عثمانی کے اثرات کا ایک مظہر یا نمونہ ہے۔ خیال رہے کہ اصل چیز رسم مصحف ہی تھا جس میں مرور زمانہ اور تطور املاء کے ساتھ بعض تبدیلیاں ہو کر رسم املائی وجود میں آیا۔ یہ نہیں کہ رسم املائی میں بعض تبدیلیاں کر کے رسم مصحف "بنایا" گیا۔ (جیسے کہ بعض حضرات کا موقف ہے)

۲:۳۴:۴ الضبط

آیت زیر مطالعہ میں ضبط کا تنوع درج ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔

وَاِذْ ،اِذْ / قَالَ، قَالَ، قَالَ/مُوْسٰى ،مُوسَىٰ،
مُوسٰى/ لِقَوْمِهٖ، لِقَوْمِهٖ ، لِقَوْمِهٖ/
لِقَوْمِهٖ/ يٰقَوْمِ ،يٰقَوْمِ ، يٰقَوْمِ / اِنَّكُمْ، اِنَّكُمْ،
اِنَّكُمْ/ظَلَمْتُمْ، ظَلَمْتُمْ/ اَنْفُسَكُمْ،
اَنْفُسَكُمْ، اَنْفُسَكُمْ/ بِاتِّخَاذِكُمُ، بِاتِّخَاذِ
كُمُ، بِاتِّخَاذِكُمُ، بِاتِّخَاذِكُمُ/ الْعِجْلَ، الْعِجْلَ،
الْعِجْلَ/ فَتُوْبُوْا، فَتُوبُوا ، فَتُوبُوٓا ، فَتُوبُوٓا/
اِلٰى ،اِلٰى/ بَارِئِكُمْ ،بَارِئِكُمْ، بَارِئِكُمْ/
فَاقْتُلُوْا، فَاقْتُلُوٓا ، فَاقْتُلُوٓا/ اَنْفُسَكُمْ، اَنْفُسَكُمْ
اَنْفُسَكُمْ/ ذٰلِكُمْ، ذٰلِكُمْ، ذٰلِكُمْ/خَيْرٌ، خَيْرٌ/

[1] و [2] بیان قاعدہ کے لیے دیکھئے المقنع (الدانی) ص ۱۶، دلیل الحیران ص ۱۱۱۔

لَکُمْ، لَکُمْ/عِنْدَ، عِنْدَ/بَارِئِکُمْ (مثل سابق)، تَابَ
فَتَابَ، فَتَابَ/عَلَیْکُمْ، عَلَیْکُمْ/اِنَّہٗ، اِنَّہٗ، اِنَّہٗ،
اِنَّہٗ/ھُوَ، ھُوَ/التَّوَّابُ، اَلتَّوَّابُ، اَلتَّوَّابُ/
الرَّحِیْمُ، الرَّحِیْمُ، اَلرَّحِیْمُ، اَلرَّحِیْمُ۔

حدیثِ قدسی

"الصَّوْمُ لِی وَاَنَا اَجْزِی بِہٖ"

میں مضمر حکمتِ دین کے بیش بہا خزانے کے حصول

اور عظمتِ انسان سے واقفیت کے لیے

ڈاکٹر اسرار احمد

کی "لقامت کہتر و بے بقیمت بہتر" تحریر

عظمتِ صوم

کا مطالعہ فرمائیں

شائع کردہ: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

"پردہ"---نفسیات کی روشنی میں

سید مظہر علی ادیب

بعض لوگ "پردہ" کے خلاف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ انسانی نفسیات ہے کہ جس قدر کسی چیز کو چھپایا جاتا ہے اسی قدر اس چیز کی چاہت بڑھ جاتی ہے اور انسان اس چھپائی جانے والی چیز کے بارے میں بالخصوص کچھ زیادہ ہی تجسس کرنے لگتا ہے۔ سیدھے لفظوں میں یہ حضرات یہ بات کہنا چاہتے ہیں کہ ایک بے پردہ عورت کے مقابلے میں ایک چادر یا برقع پوش باپردہ عورت کا گھر سے باہر زیادہ تعاقب کیا جاتا ہے اور اوباش نوجوان اس کی جسمانی حسن و جمال کی "تحقیق" کے نسبتاً زیادہ درپے ہوتے ہیں۔ اسی بات کو مزید سمجھانے کی غرض سے یہ حضرات یہ مثال پیش کرتے ہیں کہ اگر ایک آقا اپنے خادم کو کسی خاص صندوق کو نہ کھولنے کے بارے میں ہدایت کرے تو وہ خادم موقع پاتے ہی اس خاص نشان زدہ صندوق کو کھولنے کی طرف ضرور متوجہ ہوگا اور معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ آخر اس صندوق میں ایسی کیا چیز ہے کہ جس کی خاطر اسے وہ صندوق نہ کھولنے کے لئے کہا گیا تھا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جب تک ایک مسافر کی نگاہ سے اس کی منزل مقصود پوشیدہ رہتی ہے مسافر اس کی تلاش اور جستجو جاری رکھتا ہے' اور جوں ہی مسافر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور وہ اسے پالیتا ہے تو اس میں تلاش اور جستجو کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔

اگر ان دلائل اور مثالوں پر گہرا غور و فکر نہ کیا جائے تو ایک نظر میں یہ خاصے وزنی اور جان دار دکھائی دیتے ہیں اور ایک عام آدمی یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ گویا عورت کی عصمت و عفت "پردہ" کی بجائے بے پردگی میں پنہاں ہے' اور یہ کہ عورت کو چھپایا جانا غلط ہے اور اسے سب کے سامنے' پبلک میں لانا زیادہ صحیح ہے اور ایسا ہونا انسانی نفسیات کے حقیقی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن اگر ہم ان دلیلوں اور ان مثالوں پر عمیق نظر سے غور و فکر کریں اور ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ ان کا مفصل جائزہ لیں تو یہ حقیقت بالکل کھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ مخالفین پردہ کی یہ "نفسیاتی" دلیلیں اور مثالیں اتنی ہی

بے جان' بے وزن' کمزور یا بودی ہیں جتنی کہ اس ضمن میں بعض دوسری پیش کی جانے والی دلیلیں یا مثالیں وغیرہ۔

بیشک یہ انسانی "نفسیات" ہے کہ پوشیدہ اور نامعلوم اشیاء کے بارے میں انسان تجسس و آرزو کرتا ہے' لیکن یہ بھی ویسی ہی انسانی نفسیات ہے کہ ہر انسان اپنی قیمتی اشیاء کو چھپا کر' بڑی حفاظت کے ساتھ رکھتا ہے۔ سونے چاندی کے زیورات اور نقدی عموماً ہم بنک میں رکھتے ہیں یا مضبوط تالوں کے ساتھ لوہے کی الماریوں' سیفوں اور صندوقوں کے اندر بند کر کے رکھتے ہیں۔ اگر معترضین کی مذکورہ دلیل کو اس معاملے میں درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر تو کسی بھی شے کی حفاظت کا صحیح طریقہ یہ ہو گا کہ اس شے کو انتہائی غیر محفوظ انداز سے رکھا جائے۔ یعنی اگر ایک جوہری چاہتا ہے کہ اس کے بیش قیمت جواہرات چوری نہ ہوں تو اسے رات کے وقت بھی اپنی دکان کو کھلا چھوڑ دینا چاہئے' اس لئے کہ دکان بند کرنے سے چوروں کا "تجسس" بڑھے گا اور ان کے دل میں جواہرات چرانے کی "آرزو" پیدا ہو گی! استغفراللہ! یوں تو پھر انسان کو کپڑے بالکل ہی نہیں پہننے چاہئیں' کیونکہ کپڑے "تجسس" پیدا کرتے ہیں!

شریعت اسلامیہ نے عورت کے لئے "پردہ" کا اہتمام جو لازمی قرار دیا ہے تو اس اہتمام کی بنیاد بھی دوسری انسانی نفسیات پر رکھی گئی ہے۔ یعنی عورت کی عصمت و عفت ایک انمول شے ہے اور اس شے کی قابل اعتماد حفاظت کے لئے عورت کو غیر مردوں کی نگاہ یا ان کی پہنچ سے چھپانا اور بچانا ضروری ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ایک پردہ دار عورت گھر کے اندر نامحرم مردوں کے سامنے نہیں آتی اور محرم مردوں کے ساتھ بھی معاملات طے کرتے وقت حجاب کا مظاہرہ کرتی ہے' گھر سے باہر نکلتی ہے تو اپنے آپ کو سرتاپا نقاب دار چادر یا برقع میں لپیٹ کر رکھتی ہے' اس کا حسن مستور رہتا ہے' اس کے محاسن جسم کسی غیر مرد کو دعوت نظارہ نہیں دیتے' کسی شخص سے اس کی آنکھیں چار نہیں ہوتیں' کسی مرد سے وہ آزادانہ طور پر بات چیت نہیں کرتی--- بتائیے ایسی عورت کی عزت و عصمت زیادہ محفوظ رہے گی یا اس عورت کی کہ جو گھر کے اندر ہر نامحرم مرد کے سامنے آتی ہے اور نامحرم نوجوان لڑکوں کے ساتھ بے حجابانہ انداز میں گھل مل جاتی ہے' باہر جاتی ہے تو جسم کے

نشیب و فراز اور لباس کی خوبصورتی کو چھپانے کے لئے نہ چادر لیتی ہے نہ برقع! محرم و نامحرم کی کوئی تمیز نہیں' گھر سے باہر عام دعوت نظارہ دیتی پھرتی ہے؟

کیا یہ انسانی نفسیات نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص "مشکل" کی بجائے "آسانی" چاہتا ہے' دشوار راستوں کی جگہ سہل راستوں کو اختیار کرتا ہے؟ موجود پسندیدہ چیز کو چھوڑ کر غیر موجود یا غائب پسندیدہ چیز کے پیچھے پڑنا انسانی نفسیات کے خلاف ہے۔ بھوکے شیر کے سامنے اس کا ایک شکار کھلا پڑا ہوا ہو اور دوسرا شکار یا تو اس کے سامنے ہی نہ ہو اور اگر سامنے بھی ہو تو وہ کسی جھاڑی وغیرہ میں چھپا ہوا ہو' تو بتایئے وہ شیر کون سے شکار کے کھانے میں پہل کرے گا؟ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جھاڑی میں چھپے ہوئے شکار کی طرف پہلے متوجہ ہو اور کھلے اور واضح شکار کو نظرانداز کردے! بعینہ ایک ایسی عورت کہ جس کا حسن سر سے پاؤں تک ظاہر اور نمایاں ہے' بمقابلہ اس عورت کے کہ جس کا حسن سرتاپا مستور ہے' مردوں کے لئے بہتر اور سہل "شکار" ثابت ہو سکتی ہے۔ لڑکا اسی لڑکی کا پیچھا کرے گا کہ جس کے حسن و جمال کی گواہی اس کی آنکھیں اور اس کا دل پہلے ہی دے چکے ہیں۔ وہ ایسی لڑکی کے تعاقب کو حماقت اور تضیع الوقت سمجھے گا کہ جس کے حسن و جمال کا اسے فی الحال کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔

مغرب کی عورت تو مکمل طور پر بے حجاب ہو چکی ہے' تو کیا مردوں کے ہاتھوں اس کی عزت و عصمت محفوظ ہو چکی ہے؟ کیا وہ اپنے آپ کو عفت مآب تصور کرتی ہے؟ کیا یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات رہ گئی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ناجائز بچے انہی مغرب کی آزاد اور قلیل اللباس عورتوں کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں؟

معترضین کو ایک اور ضروری بات نہیں بھولنی چاہئے اور وہ یہ کہ "چھپنا" خود عورت کی فطرت یا نفسیات میں شامل ہے۔ قدرت نے "حیا" اس کی سرشت میں شامل کردی ہے۔ اگرچہ غلط ماحول نے عورت کی اس نفسیات کو وقتی طور پر متاثر کیا ہے' تاہم وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنی اس دبی ہوئی نفسیات کا برملا اظہار کرتی رہتی ہے۔ مثلاً حال ہی میں جب خواتین کو "حسینۂ عالم" کے انتخاب کے سلسلے میں منصفین کے سامنے تیراکی کے کپڑوں میں آنے کے لئے کہا گیا تو ان سب نے ایسا کرنے سے بیک آواز انکار کردیا! عربی' فارسی اور

اردو میں عورت کے لئے جتنے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سب کے لغوی معنی "چھپنے" یا "پوشیدہ" رہنے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الواقعہ میں جن "بڑی بڑی آنکھوں والی' گوری حوروں" کا ذکر فرمایا ہے' ان کے لئے بھی "اللُّؤلُؤ الْمَكْنُون" کا لفظ استعمال فرمایا ہے (یعنی محفوظ رکھے ہوئے آبدار موتی!)

انسانی جسم میں وہ تمام اعضاء کہ جن پر زندگی کا دارومدار ہے یا جن کا نقصان سارے جسم کا نقصان ہے' مثلاً دماغ' دل' گردے' جگر' پھیپھڑے وغیرہ' اللہ تعالیٰ نے ان سب اعضاء کو انتہائی محفوظ طریقے سے چھپا کر رکھا ہے۔

جدید ماہرین طب نے عورتوں کے مردوں کے مقابلے میں مختلف امراض کا کم شکار ہونے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ وہ (یعنی عورتیں) مردوں کی نسبت اپنے جسم کو زیادہ کپڑوں سے ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عورتوں کے لئے اپنے عام کپڑوں کے اوپر کوئی لمبی چادر' برقع یا کوٹ وغیرہ لینا صحت کے نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں (سورۃ الاحزاب:۵۹) صاف فرماتے ہیں کہ: "اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ پہچانی جائیں گی اور ان کو ستایا نہ جائے گا۔"

کیا اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر بھی کوئی اور انسانی نفسیات سے واقف ہے؟ وہ تو کل نفسیات کا خالق ہے۔ عام عورتیں تو کجا رہیں اللہ تعالیٰ تو نبی کریم ﷺ کی نیک ترین بیبیوں کو بھی اپنا "بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرنے" کا حکم دیتے ہیں۔ نیز انہیں وقار کے ساتھ گھروں میں جمی بیٹھی رہنے کے لئے ہدایت دیتے ہیں۔ (سورۃ الاحزاب:۳۲-۳۳)

اللہ کے بعد انسانی نفسیات کو سب سے زیادہ جاننے اور سمجھنے والے ہادیٔ برحق رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے"۔ (ترمذی کتاب الرضاع)--- مسند احمد' جلد ۶ ص ۲۹۷ پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی نقل ہوا ہے: "عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے' لہٰذا تم اس کو گھروں میں چھپاؤ۔" (عیون الاخبار' جلد ۴' ص ۷۸)

علامہ اقبال کا قول ہے: "عورت کا جنسی تقدس اس امر کا متقاضی ہے کہ اسے اجنبی نگاہوں سے ہر طرح محفوظ رکھا جائے۔ عورت ایک بہت ہی عظیم ذریعہ تخلیق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی تخلیقی قوتیں مستور و محجوب ہیں۔"

علامہ اقبال کے دو مشہور اشعار ہیں:

عزت ہے محبت کی قائم اے قیس حجابِ محمل سے
محمل جو گیا عزت بھی گئی' غیرت بھی گئی' لیلیٰ بھی گئی!

اور

آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر!

امام غزالیؒ کا مشہور قول ہے: "عورت کو ضعف اور ستر سے پیدا کیا ہے۔ ضعف کا علاج خاموشی اور ستر کا علاج پردہ میں رکھا گیا ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "عورت کی خوبی دو باتوں میں ہے۔ اول کہ اسے کوئی نامحرم نہ دیکھے' دوسری یہ کہ وہ کسی نامحرم کو نہ دیکھے۔"

عورت کے حوالے سے انسانی نفسیات پر بحث کرتے ہوئے ہمیں مردوں کی نفسیات مع جنسیات کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ مرد فطرتاً عورت کا پرستار ہے' وہ عورت کی طرف بے اختیار کھنچا آتا ہے' کبھی کبھی وہ اسے حاصل کرنے کے لئے تخت و تاج کو بھی لات مار دیتا ہے۔ گھربار' وطن' عزیز و اقارب' یہاں تک کہ اپنا عقیدہ اور مذہب تک چھوڑ دیتا ہے' اسے پانے کے لئے خون خرابا کرتا ہے' اس کے عشق میں اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ عورت کی انفعالیت' قبولیت' تاثیر اور مغلوبیت کی صلاحیتوں کے مقابلے میں قدرت نے مردوں کو فاعلیت' قابلیت' تأثر اور غلبہ کی استعداد بخشی ہے۔ نیز دونوں کی جسمانی مشینری میں کچھ ایسا فرق رکھا ہے کہ ایک کا گناہ چھپ سکتا ہے تو دوسرے کا گناہ مجسم گناہ بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

and work righteously, He will remove from them their sins, and He admit them to gardens beneath which river flow to dwell therein for ever: that will be the Supreme Achievement.

The most significant point of the hadith should be kept very clearly in mind. The Holy Prophet (peace bu upon him) has enjoined upon all Muslims to struggle against evils in particular perpetrated and supported by the so-called Muslim rulers and heads of governments in Muslim countries. Since they control the print and electronic media and other influential agencies, they can very effectively promote un-Islamic ideas and practices in the society. In the earlier part of the hadith (not quoted extensively in the above lines) the Prophet has explicity mentioned the gradual decline of religious and moral fervour particularly in persons at the helm of communal affairs ostensibly and a plea was made to reform and correct them. Similarly religious scholars and spiritual leaders are also covered by this category as they too influence the populace through their teachings and example. And if they go wrong, misconceptions and false notions may spread very widely. As already explained above, this hadith behooves all committed and true Muslims to mobilize their resources to the full and employ all the variegated forms of protest and agitation—rights of which are guaranteed to them by democratic set-up—to struggle against the evil-mongers and anti-Islam agents. A recourse here to the technicalities of "Khuruj" (i,e revolt or uprising against the established political authority) is simply besides the point: pure (and idle!) scholastic academicism that kills the required dynamism and religious activism of Islamic revivalist movement.

* * *

a true and committed Muslim will not develop warm and close relationship with those indulging in un-Islamic practices. But if he does not do that, he will be generally taken to endorse or accept the un-Islamic practices and thus loose the whole point of his protest against them. Indeed, according to an other hadith of the Prophet (peace bu upon him), such a complacent and 'liberal' Muslim gradually ceases to have even passive inward disapprobation of evil practices and himself starts indulging in them openly. Serious notice of this point should be taken by all of us. The criterion and the norm for all our likes and dislikes and for all our social relations and friendships should be Islam and nothing else.

The last assertion of the Prophet in the above mentioned hadith is particularly noteworthy. The words '.....beyond that there is not even one grain of *iman*' should provide an impetus to all God-fearing Muslims for deep thinking and soul-searching. They should assess their own *iman* and faith in the light of this hadith and should refrain from making a judgment about others. Earlier on in this essay we have endeavored to understand clearly the distinction between Islam and *iman* and so we can at this juncture very well appreciate the point that the *iman* that is being negated here is the true faith and *iman* of the heart or inner self. A man failing in the said requirements or performatives would not cease to be a Muslim in the strict legal sense of the term. However, on the Day of Judgment in the Hereafter only true inner conviction and *iman* would be of significance in winning a man his salvation and felicity. It will be the real basis of final loss and gain as we read in verse 9 of Surah Taghabun:

> The Day that He assembles you (all) for a day of Assembly—that will be a day of mutual loss and gain (among you) and those who believe in God

some disciples or companions who truly acted upon God's commandments and followed the Messenger's example. This would continue for a generation or two and then religious fervor would gradually start diminishing. Moral puritanism preached by the Prophet and his companions gradually declines and gives place to degeneration and innovation. (And as a matter of truth, each innovative addition in Islam comes in place of an action enunciated by the Quran and Sunnah.) The later generations of so-called believers have been very aptly described by the Prophet thus: '..... people who say what they do not do and do what they have not been permitted to do'. And this is all the more true about we Muslims living in the 15th century after Hijra. Temporally we are so far removed from the times of the Holy Prophet and the companions that there is tremendous deviation from the ideal Islam as projected by the teachings of the Quran and the Prophet. And the present hadith is a clarion call for changing and stopping all that is disliked and disapproved by the Creator of the universe.

This hadith too pointer to three levels of 'nahee anil munkar' exactly in the same manner and order of priority as were delineated by the hadith discussed earlier. The three levels are:

(i) Struggling against evil and un-Islamic actions with hand.

(ii) Struggling against them with tongue.

(iii) struggling against them with heart.

The first two have already been explained in the above paragraphs. Some additional points with respect to the third should be noted here. Disliking the evil inwardly and struggling against it with one's heart necessarily implies that

means to physically counteract or defend, at least his face will become red with rage and exhibit utter disgust and displeasure.

The example given in the preceding paragraph also sheds light in a parallel way on the degree and depth of a Muslim's commitment to Islam and *iman*. If he is not in a position to check and physically stop anti-Islamic actions, he protest against them using all the means at his command. He is even ready to face the atrocities of state agencies like batten-charging and firing. Indeed his greatest desire is to lay down his life for the cause of Islam. The last part of the hadith under consideration—and that is the weakest *iman*—implicity demands that Muslims as a collectivity should try their utmost to acquire strength and power to completely eradicate evil and satanic behaviour from the society.

Now let us study closely the text of the second hadith:

Abdullah Ibn Masud, Allah be pleased with him, (in a long hadith which describes how power and leadership will pass on to the people who say what they do not do and do what they have not been permitted to do), says: Allah's Messenger, blessings and peace be upon him, said: He who struggles against them with his hand (i,e:, physically), he is the Believer; and he who struggles against them with his tongue, he is the Believer; and he who struggles them with his heart, he is also the Believer: but beyond that there is not even one grain of *iman*. (Muslim)

In this long hadith the Holy Prophet (peace bu upon him) starts by mentioning the fact that whenever Allah sent a Messenger to people, he would get from amongst them

should feel disgusted and condemn evil with his heart. Far from showing apathy, he should feel disturbed and perturbed. This will itself be a pointer to the fact that the person has *iman* or faith, even though minimal and of the lowest degree. The word 'adaff' used in the hadith is of the superlative degree and as such signifies the 'weakest' or the 'faintest' In an other Prophetic saying instead of the expression 'that is the *lowest iman*', the following description has been used: 'and after this, *iman* is not present even in as meager a quantity as a small grain. That is to say, if one of the attitudes out of the above three is not adopted by a Muslim, it would mean that true faith and *iman* is almost nonexistent in the core of his heart.

(v) The three attitudes mentioned and the corresponding states of *iman* are not to be measured and judged by an external observer. No objective formula can be used in determining the faith-state of a person. Each individual Muslim can be a judge in his own case and choose the best highest possible course of 'nahee anil-munkar'. It all depends on the intensity and depth of one's *iman* and the degree of one's commitment to the cause of Islam. Each individual Muslim himself can measure these for himself. No body else can do it for him or make a wholly correct judgment upon his assessment. Nevertheless, the inward state of one's *iman* is reflected by the external attitude and behaviour. For example if a person keeps silent or remains passive when his father or mother is publicly disgraced, this attitude of his is a sure indication of his unconcern or apathy towards his parents. O else it shows that he lacks courage or even he is impudent or disrespectful. If a person is not impudent and shameless but somehow lacks the

government in the county, it is the duty and responsibility of the government to use all its force to eliminate un-Islamic practices. But in case the government remains complacent in this regard, it is the duty of all true Muslims to force people to shun evil and loathsome actions within the sphere in which they can exercise authority. For example, a father or an employer should use a reasonable amount of force in correcting such subordinates who indulge in immoral and forbidden activities.

(iii) If neither the state authorities discharge their duties with regard to 'nahee anil-munkar' nor an individual true Muslim musters power to check all that is wrong, he must, as the second best alternative, verbally denounce it and ask or request the person concerned to give it up. In the present age this will also include writing and publishing in the print media articles condemning un-Islamic patterns of behaviour so that public opinion is mobilized against the evil. Indeed 'changing or stopping the evil with tongue' involves all the variegated moves of protest and agitation permissible in a democratic set-up. Both individuals in their private capacity and Islamic groups collectively should use all their resources of speech and printed word for increasing people's awareness and sensibility against satanic tendencies of thought and action. They should do this boldly, remaining undaunted by the criticism and harassment of the general public or government.

(iv) In case social and political conditions in a place are so repressive that a truly committed Muslim cannot even use his tongue or pen in denouncing the evil, then he should at least feel pain inwardly. He

> O my dear Son! be constant in prayer, and enjoin the doing of what is right and forbid the doing of what is wrong, and bear in patience whatever (ill) may befall thee ..... (Luqman: 17)

How much 'nabee anil munkar' is important and how much emphasis was put on it by the Prophet (peace bu upon him) can be seen in the light of two *hadiths* from 'Muslim' — one of the most authentic collections of hadith. The first, hadith goes like this:

> Abu Said al-Khudri, Allah be pleased with him, says: Allah's Messenger, peace be on him, said : If any of you sees some wrong he should change it with his hand; if he is unable to do so, then with his tongue; even if he cannot do that, then with his heart; and that is the weakest *iman*.

A close and thoughtful perusal of this Prophetic saying brings out the following noteworthy points:

(i) In this *hadith* there is no mention of 'amr bil-maroof' i.e., enjoining good. This means that 'nahee anil munkar' i.e., changing or stopping the evil is an independent and equally significant activity in the value-structure and obligations of our faith. A religiously wrong or evil action is in fact a transgression of the limits laid down by the Creator and as such a true and faithful believer cannot remain passive or unconcerned on the violation of Divine commandments.

(ii) Changing or stopping evil with one's hand obviously means that all available power and authority should be used in curbing wrong action and routing out evil from the society. If there is an Islamic

economic life and politics, whatever misuse of resources and human knowledge for destruction instead of welfare and enlightenment there may be, the reason is bad leadership. There is no lack of good and high-minded people in society; the problem is that power is concentrated in the hands of people immersed in materialism and ungodliness. To change this situation it is not enough to preach sermons, exhort people to obey and worship God or to invite them to adopt high moral standards. Rather it is necessary for morally-just people to search each other out and strive to achieve enough collective power to wrest control of society from the morally corrupt. What is needed to change the centre of power and authority is effort. The revolution requires a coming together of the righteous in a common cause."

After having understood the first two objectives for which the Muslim Ummah should earnestly work for and the subtle but crucial difference between them, let us now move on to discuss at length the third one as delineated by the verse—viz; '*nahee anil munkar*' or forbidding people from all the that is morally bad and evil. Unfortunately a large majority of religiously devout and noble people remain unmoved at the sight of evil deeds and morally wrong actions. They just remain complacent or unconcerned while people are engaged in un-Islamic activities. They think that only inviting them to good and virtuous actions through advice and sermon is enough and something worth doing. The truth, on the other hand, is that I can at least cite nine such places from the Quran where inviting or calling people to good and forbidding and stopping them from evil have been mentioned jointly. They have been mentioned together so costantly that it seems as if the two are integral aspects of one single activity or two parts of one organic whole. Or else one is as it were concomitant to the other. For example in Surah Luqman, among the advice given by Luqman to his son, we read:

resorted to in this regard. No true Muslim can absolve himself of this obligation of 'amr bil-maroof' (of course, within the sphere of his/her authority) on the pretext that this duty can be discharged only by the Muslim political leadership of the state. Complete and total observance of Islamic law (i, e. Shariah) and morality, no doubt, is possible only when a change or revolution in a favour of the Quran and the Prophet's Sunnah is brought about by the Islamic revialist movement in the country's leadership. This all important point was very clearly realized and forcefully presented by Late Maulana Mawdudi-one of the chief influential writers and leaders of the contemporary Islamic resurgence. I shall here quote a long relevant passage from hi Tehrik Islami Ki Akhlaqi Bunyadain rendered into English by Khuram Murad. There lines will put into bold relief the difference between 'dawah' and 'amr bil-maroof':

"The objective of the Islamic movement, in this world, is revolution in leadership. A leadership that has rebelled against God and His guidance and is responsible for the suffering of mankind has to be replaced by a leadership that is God-conscious, righteous and committed to following Divine guidance. Striving to achieve this noble purpose, we believe, will secure God's favour in this world and in the next. It is regrettable that both Muslims and non-Muslims have tended to lose sight of the significance of this revolution. Muslims all too often consider it necessary only from the point of view of political expediency, and have no appreciation of its central place in their religion. Non-Muslims, partly from prejudice and partly from lack of information, do not understand that ungodly leadership is at the root of the evils afflicting humanity and that it is essential for human well-being that the affairs of the world should be directed by moral and God-fearing people. Whenever corruption is let loose in the world, whatever injustice is done, whenever tyranny or oppression exists, whatever poison flows in the veins of human culture,

transgressed all bounds of equity! But speak unto him in a mild manner, so that he might bethink himself or (at least) be filled with apprehension. (Ta Ha: 42 - 44)

Thus 'amr bil-maroof' is a step higher than mere 'dawah ila al-khair' or preaching and as such it calls for different methodology and approach. 'Amr' literally means to order, dictate or enforce on the basis of authority. This necessitates, at the societal or state level, a change or revolutions in the whole power structure so that the morally good and right is implemented and enforced with the authority of governmental institutions. Supporting evidence for this is also provided by the fact that the expression 'amr bil-maroof' was first used in Surah Hajj when the Prophet and his Companions were obliquely given the glad tiding of political power in a region. The verse 41 of the Surah reads:

(They are) those who, if we establish them in the land, organize regular prayer and give regular charity, enjoin the right and forbid wrong.(Hajj:41)

Soon after the revelation of this Surah the Islamic state of Madina was established and the laws of Shariah and religious practices were enforced by the Prophet in the capacity of the political ruler of Madina. However, a very important point must be clearly appreciated and understood by all of us at this juncture. Absence of Islamic political power at the state level does not imply that the Quranic injunction of 'amr bil-maroof' has no scope or relevance for individual Muslims. Each individual Muslim who wields power over some persons in his home, factory, office or business establishment, is under obligation to act upon this injunction. He or she must enforce religious and moral commandments upon the subordinates and dependants. If need be, even force or moderate punishment may be

the Arabic verb *'amr'* is definitely more and stronger than just advising or preaching sermons: it additionally implies commanding and enforcing with force. Thus *'amr'* is quite a wide expression. Starting from moralizing it goes upto bringing about a revolution in political leadership so that corrupt and ungodly people are forced to be righteous and follow Divine guidance.

An other difference between *dawah* and *amr* is that *dawah* (i, e., preaching and exhorting) is never undertaken in an authoritative manner. On the contrary, it is always performed in a warm and heart-moving manner. In *dawah* one pleads and even requests people most humbly to uphold goodness and probity. The *daee* (i., e one who performs the *dawah*) is always on the look out for an appropriate moment when he can approach people in a receptive mood. He even requests them in the name of God to order their lives according to the dictates of Islam. His role is both of an evangelist (i, e. one who gives glad tidings on moral actions) and of a warner of the torments of hell-fire. He is always very polite; and never harsh, aggressive or authoritative. This indeed is the attitude which members of Tableeghi Jamaat have adopted for the past several decades for their missionary activities. In *dawah* one speaks from the depth of ones heart and strikes a cord in the interlocutor's heart as the preacher is definitely taken as a well-wisher. This difference amply shows why calling people to goodness has been mentioned by the Quran as distinct and separate from 'enjoining what is morally right'. The mild and polite manner to be adopted in *dawah* was required of Moses and Haroon when the two Messengers were ordered by God to go to Pharaoh. We read in Surah TaHa the following verses:

> Go forth (then) you and your brother, with My messages, and never tire of remembering Me: go forth, both of you, unto Pharaoh: for, verily, he has

Say : In this bounty of God and in His Mercy — in this, then, let them rejoice: it is better than all (the worldly wealth) that they may amass! (yunus : 57 - 58)

These two verses clearly tell us how majestically Quran describes its own magnificence. Those who do wrong have a disease in their hearts, which causes their spiritual death. God in His mercy declares His Will (i.e., the Quran) to them which should direct their lives and provide a healing for their spiritual malaise. If they accept Faith, the remedy acts; they find themselves in right guidance and receive God's forgiveness and mercy. Surely this guidance—the Quran—is far better a gift them material advantages, wealth or possessions. Therefore, according to this verse, the referent of 'khair' is Quran itself, something far superior to what worldly people hoard. Worldly possessions and wealth have also been termed as 'khair' by the Quran. For example a verse of Surah Adiyaat reads:

..... for, verily, to the love of wealth is he most ardently devoted.

This of course refers to a natural inclination and disposition of man. Yet we are told in very clear and categorical terms that the divine gift bestowed upon us in the form of the Quran is in reality far better than material riches and belongings. So *dawah ila al-Khair* (that is to say, inviting and calling people to goodness) is in fact exhorting men to study and act upon the Quran.

While the first objective or aim of the ummah's missionary work is specifically with respect to the Quran the second one is quite general and broad. It includes advising, admonishing, preaching and exhorting people to all that is morally right and virtuous. However the literal meaning of

comrades in order to make up an ideological group. Verse 104 of Surah Al-i-Amran enlightens us about the three objectives and aims this collectivity of self-conscious and motivated Muslims is to work for:

(i) Calling and inviting people to all that is good and noble.

(ii) Enjoining and dictating the doing of all that is right and virtuous.

(iii) Forbidding the doing of all that is wrong and immoral.

First of all, let us discuss the first two objectives and goals of the real and hard-core Muslim ummah's struggle. The Islamic summons has by and large been understood by Muslims to be in general call to *iman* and righteous action in conformity with the guidance of Revelation : sommoning people to God and telling them to follow His and His Messenger's dictates. But the crucial question that must be asked here is: Do the Quranic injunctions 'calling and inviting people to all that is good' and 'enjoining the doing of all that is right' mean one and the same action. We, however, cannot think for a minute that God Almighty has here used synonymous alternative expressions for pointless repitition. They certainly mean and imply different performances or levels and intensity of operations. *Dawah ila al-khair* and *Amr bib-maroof* are obviously semantically distinct expressions and thus connote different types of activities. Most probably *dawah ila al-khair* means calling and inviting people to the Quran as according to the Holy Quran the highest khair (i,e., good) is the Quran itself. To substantiate this the following verses of Surah Yunus can be cited:

> O mankind! there has come unto you an admonition (or a direction) from your Lord, and a healing for the diseases in your hearts — and for those who believe a Guidance and a Mercy.

AN UMMAH WITHIN UMMAH

In the light of these facts the verse under consideration with the particularizing sense of preposition in the expression 'min kum' assumes special significance and its meanings become quite intelligible. In effect what it means is that even when the vast multitudes of people in the Muslim Ummah are in a state of slumber, are divided among themselves and pursuing only secular ends — there should be a group or party within the larger ummah that performs the duties laid down by the Quran in this verse. Some readers may wonder as to what an ummah within the ummah means. I am sure you must be familiar with the expressions of 'a state within state' and 'a party within party'. Those among you who have read about the freedom struggle of the Indian subcontinent know very well that the Indian National Congress was a big political party and there was a forward block of it within the Congress that consisted of rather more revolutionary members. The forward block stood for more radical strategy as compared with the ordinary political policies approved by the Congress. Despite their membership and loyalty to the Indian Congress, they constituted a separate group under the leadership of Subhash Chandra Boas. Similarly since in the contemporary context the universal Muslim Ummah has been reduced to the level of an abstract concept, its reification is needed in the form of a smaller group (from among the larger ummah) consisting of such Muslims as have fulfilled to the maximum possible degree the requirements and demands made in verse 102 of the Surah with respect to the individual behavior and practice of a true Muslim. They attain the driving force of *taqwa* (i, e., God - consciousness) in their hearts and meticulously observe the commandments of the Holy Prophet (peace bu upon him). Moreover, in compliance to a fair degree with the imperatives of the next verse, they hold fast to the Quran for guidance even in minor details of their lives and unite and join together as

province of Sind between the locals and the migrants and this discrimination eventually led to the formation of MQM in Sind. Again the Arab world, where all speak and write in Arabic, is divided in a number of nation-states and people there identify themselves with reference to distinct nationalities.

So the hard fact that we must accept to is that today a united world Muslim Ummah is non-existent. The *defacto* position is frankly none other than this. It only exists as an ideal concept in the minds of Muslims who consider theoretically all believers of Islam and the Prophet (peace be upon him) as members of one global religious fraternity. According to this belief, each confessor of Muhammad's Prophethood is regarded his *ummati* and a member of the universal Muslim brotherhood or Ummah. This belief in itself is perfectly correct, but the question is whether Muslims all around the world in fact behave as a well-knit ideological group. Is there any discipline in Muslim? Is there a plenary leadership among Muslim nations and are the directive and recommendations of that leadership heeded to by the member states? I regret to say that the answer to all these questions is in the negative. Was not a large part of Afghan army with the Russians when the latter were killing Afghan people mercilessly? Were not the most inhuman attrocities against Afghans were committed by their own Islam-professing Afghan brethren? Again was not the long and devastating war between Iran and Iraq between two Muslim countries? Armed clashes between different factions of Muslims in Lebanon and brutal and murderous assaults on Palestinian refugee camps are known to any body in touch with modern media. And the recent Khaleej war has proved beyond an iota of doubt that one world-wide Muslim Ummah does not exist as a matter of fact.

many Muslim nations in the world. Even Allama Mohammad Iqbal, a great advocate of the unity of Muslim Ummah, had to be realistic about the actual condition of Muslims in the world. In his lectures Reconstruction of Religious Thought in Islam, accordingly, he wrote that there is no one united Muslim Ummah in the world; rather there are many Muslim nations living in different states. However, perhaps this too was true more than half a century ago when Allama Iqbal delivered the Lectures. The present situation of most Muslim nations is worse still and most Muslim nations are split into numerous regional, ethnic or linguistic groups. The readers of these lines can very well appreciate this fact if they consider the case of Pakistan. At the time of its appearance in 1947 as a separate homeland for the Muslims of the Indian Sub-continent, Pakistanies were considered as one Muslim nation by all. Both wings of Pakistan were united and considered Islam the basis of their unity. Soon afterwards, however, regional sentiments and concern for regional languages came upon the surface and eventually paved the way for the cecessation of East Pakistan. Consequently it became Bangladesh in 1971 and asserted her Bengali identity more than the former Muslim character. Every one of us laments how savagely and brutally non-Bengali Muslims were tortured and murdered by the Bengali nationalists of East Pakistan. And in the truncated Pakistan too there is no ideological unity in the people. The Pakistani nation stands divided and fragmented on the bases of ethnicity, culture and language and different groups are constantly at war with each other. Since not a single province of Pakistan has only one ethnic community, we often hear news of gruesome violence and brutalities among various communities living in one province and even in one city. For example in Baluchistan there are at least three large ethnic groups and to a lesser degree this is also true about other provinces of Pakistan. In Sind the mahajirs (migrants from India) have formally assumed the status of a politico-cultural entity. Indeed from the very beginning distinction was made almost every where in the country but particularly in the

'minkum' in the verse is general and descriptive, while for some others it is of particularizing nature. Leaving aside the technicalities of the two types of 'min' just mentioned, let us see what difference, if any, is made in the meaning of the verse by either use of it. According to the former the verse would be translated as : And you should together form a group that invites people to all that is good and ....., whereas according to the latter sense of 'min' the translation would be: And from among you there must be a group or party that invites people to all that is good and .....'. Now in my view both these translations of the verse are entirely correct and the logical import of the meaning of the verse in hardly changed by the minor linguistic differences of the two translations. If all the Muslims of the world unite and together constitute an ideological fraternity (i. e., Muslim Ummah) that performs the duties of inviting people to all that is good, enjoin the doing of all right actions and forbid the doing of all that is wrong—this would be the import of the verse according to the descriptive or indicative use of 'min'. But since this descriptive function of the whole of Muslim Ummah is repeated a little further on in verse 110 of this very Surah a large majority of Quranic Scholars take 'min' in the particularizing sense and interpret the verse by maintaining that it demands the formation of a group comprising of committed and motivated Muslims from among the vast Muslim fraternity of less motivated believers. That is to say, this verse provides answer to the question : what should be done when by and large the Ummah neglects its religious obligations and responsibilities and thus pays no heed to its divinely ordained duties.

Let us frankly acknowledge the hard facts and conditions of present-day Muslims however unpleasant they may appear to us. Theoretically the word Muslim 'Ummah' covers in its fold all the Muslim of the world and as such it is a universalistic concept. But as a matter of fact one global Muslim Ummah is at the moment a non-entity. There are

THE GOAL AND OBJECTIVE OF THE MUSLIM UMMAH

(Three-Point Action-Agenda for The Muslim Ummah-Part III)

Dr. Israr Ahmad

(Translated into English by: **Dr. Absar Ahmad)**

Let us now concentrate our attention on the third verse (verse 104 of Surah Al-i-Imran) the English translation of which reads:

> And from among you there must be a party (a group or band of committed Muslims) who invite people to all that is good and enjoin the doing of all that is right and forbid the doing of all that is wrong. It is they who attain true success and felicity.

An objective and detailed study of the preceding two verses of the Surah leaves no ambiguity or doubt in the mind of the reader that both of them call for a collectivity of believers and that a serious and sincere action on their dictates necessarily demands the formation of a group or party. Now the question arises : what is the objective or goal this group should keep in view and work for? As a matter of fact all creations and artifacts are made for serving some purpose. Even a small and modest association of people is constituted and organized for achieving certain goals defined in the memorandum of aims and objectives. So the question that quite naturally arises is : what is the purpose or goal of that group which results from collectively clinging to the Quran? This exactly is what is explained in the verse under review. This verse has been translated in two different ways by the translators. For some the preposition 'min' of

الحمد للہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی سے عمومی استفادے اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے

خط و کتابت کورس

کا اجراء گذشتہ سالوں کے دوران ہو چکا ہے۔

○ پہلا کورس "قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی" کے زیر عنوان ہے' جو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کے ۴۴ کیسٹ اور چند کتب پر مشتمل ہے۔

○ دوسرا کورس ابتدائی عربی گرامر کی تدریس سے متعلق ہے جس میں "آسان عربی گرامر" سبقاً سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کا مفہوم براہ راست سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تحصیل اشد ضروری ہے۔

سال ۱۹۹۴ء کے آغاز ہی سے خط و کتابت کورس میں داخلہ لیجئے اور گھر بیٹھے قرآن حکیم کی رہنمائی اور عربی زبان کی تدریس سے فائدہ اٹھایئے۔

نوٹ: ہر دو کورس کے پراسپکٹس' داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبہ خط و کتابت کورس' قرآن کالج' ۱۹۔ اے اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے طلب فرمائیں۔

فون: ۸۳۳۶۳۷-۸۳۳۶۳۸

المعلن: مدیر شعبہ خط و کتابت کورس' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور